ناول
پلوتا
سلیم شہزاد
سرائیکی سے ترجمہ
نجم الدین احمد

شاہکار سرائیکی ناول کا ترجمہ

پلُوتا

سلیم شہزاد

تعارف و ترجمہ:

نجم الدّین احمد

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ مصنف یا ادارہ عکس پبلی کیشنز سے باقاعدہ تحریری اجازت
کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا. اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتِ حال
ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

کتاب پلُوتا

مصنف سلیم شہزاد

تعارف و ترجمہ نجم الدّین احمد

صفحات 184

اشاعت 2019

تعداد 500

قیمت 400

AKSPUBLICATIONS
Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph:042-37300684,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

سرائیکی زبان کے
ناول نگاروں
کے نام
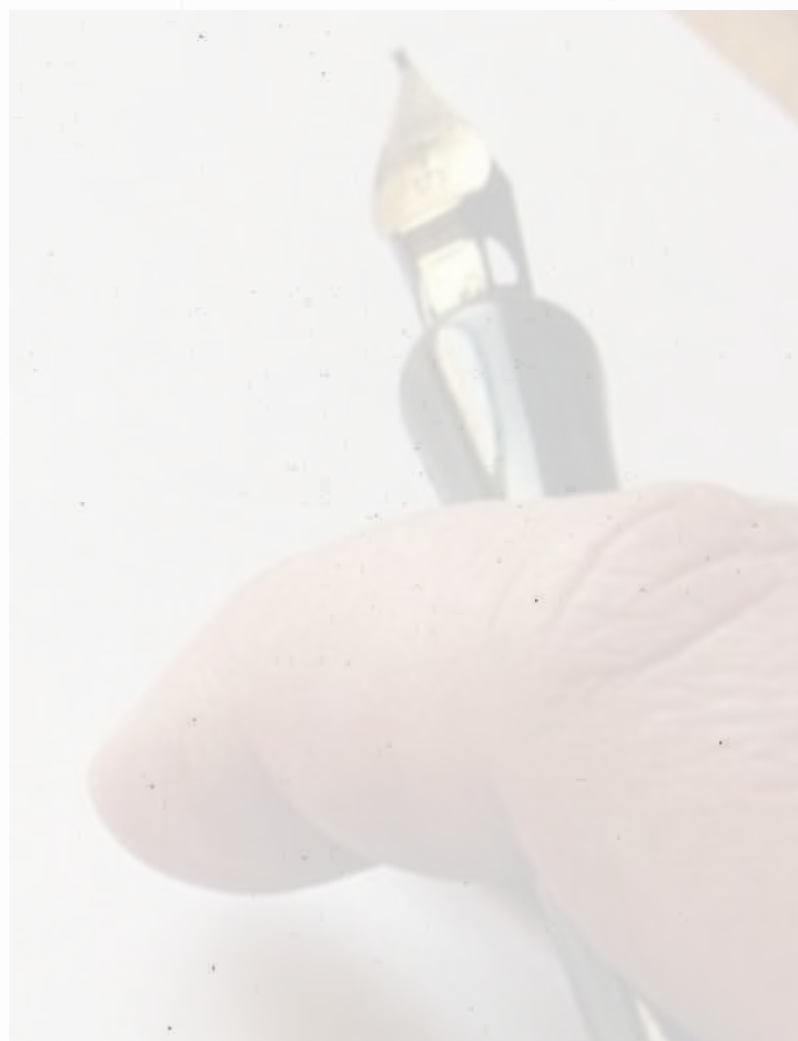
فہرست

تعارف

یُوں تو اُردو، پنجابی اور سرائیکی کے ادیبوں، شاعروں اور قارئین کے لیے سلیم شہزاد کا نام تعارف کا محتاج نہیں لیکن شاید قارئین کی اکثریت اُن کی شخصیت کی ہمہ جہتی سے مکمل طور پر آشنا نہ ہو۔

اصل نام محمد سلیم شہزاد لیکن صرف سلیم شہزاد کے نام سے لکھتے ہیں۔ اُن کے آباواجداد کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے ہے جہاں مقامی طور پر سرائیکی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یُوں سرائیکی اُن کی مادری زبان ہے۔ اُن کے دادا نے بسلسلہ روزگار بہاول نگر میں بود و باش اختیار کی اور پھر اُن کا خاندان ہمیشہ کے لیے یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بہاول نگر کی مقامی زبان پنجابی ہونے کے ناطے اُنھیں پنجابی پر عبور ہُوا۔

سلیم شہزاد ۱۵ دسمبر ۱۹۵۷ کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہُوئے۔ لیکن اُن کی پرورش بہاولنگر میں ہُوئی اور اُنھوں نے یہیں کے تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی۔ سیاسیات میں ایم اے کے ساتھ قانون کی ڈگری (ایل ایل بی) بھی حاصل کی۔ بہاول نگر ہی میں لیبر ڈیپارٹمنٹ میں بطور مینیجر محکمہ روزگار تعینات رہنے کے بعد ۱۵ دسمبر ۲۰۱۷ء میں اپنے عہدے سے سبک دوش ہُوئے۔ شاعری کا آغاز بہ یک وقت اُردو، پنجابی اور سرائیکی سے ۱۹۷۴ء میں کیا۔ تب ہی سے اُن کی نظمیں اِن تینوں زبانوں کے رسائل و جرائد کی مسلسل

زینت بن رہی ہیں۔ ابتدا میں اردو میں غزلیں بھی کہیں لیکن طبیعت نظم گوئی کی طرف زیادہ مائل تھی لہٰذا بعد میں صرف نظم کے ہو کر رہ گئے۔ اُن کا سب سے پہلا مجموعہ ''ماسوا'' اردو نظموں پر مشتمل تھا جو ۱۹۹۶ء میں کراچی سے اشاعت پذیر ہُوا۔ دُوسرا مجموعہ ''کاں بنیرے سکن'' پنجابی نظموں کا تھا جو ۲۰۰۵ء میں لاہور سے شائع ہُوا اُور پنجابی زبان و ادب کا معروف انعام ''مسعود کھدّر پوش ایوارڈ'' حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اِس مجموعے کی خاص بات یہ تھی کہ یہ بہ یک وقت شاہ مُکھی اور گور مُکھی زبانوں میں شائع ہُوا تھا۔ دائیں صفحے پر نظم شاہ مُکھی میں تھی تو بائیں صفحے پر وہی نظم گور مُکھی میں۔ اِس مجموعے کو ہندوستان میں بھی خُوب پذیرائی ملی۔ سرائیکی نظموں کا مجموعہ ''پیریں ٹُردا شہر'' قومی ادبی ایوارڈ ''خواجہ فرید ایوارڈ'' کا حق دار پایا۔ یہ مجموعہ ملتان سے ۲۰۰۷ء میں منصۂ شہود پر آیا تھا۔ ۲۰۰۹ء میں اُردو نظموں کا دُوسرا مجموعہ ''قسم ہے کفارے کی'' طبع پذیر ہُوا۔ ۲۰۰۹ء ہی میں اُن کی بطور شریک مرتب انیس ناگی پر مضامین کی کتاب ''نئے ادب کا معمار—انیس ناگی'' بھی سامنے آئی۔ جب کہ سلیم شہزاد کا پانچواں اور پنجابی نظموں کا دُوسرا مجموعہ ''نیندر بھجیاں نظماں'' ۲۰۱۵ء زیورِ طباعت سے آراستہ ہُوا۔ اِس مجموعے کو بہ یک وقت پاکستان اور ہندوستان سے شاہ مُکھی اور گور مُکھی میں علیحدہ علیحدہ شائع ہونے کا اعجاز حاصل ہے۔

اُنھوں نے متعدّد اُردو افسانوں کو پنجابی اور سرائیکی میں ترجمہ کیا جب کہ پنجابی اور سرائیکی افسانوں کو بھی اُردو کے قالب میں ڈھالا جو مختلف جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ اِن تراجم کا مجموعہ بھی زیرِ ترتیب ہے جس کی جلد منظرِ عام پر آنے کی توقع ہے۔ بہت کم پایا گیا ہے بلکہ شاید ہی ایسا ہو کہ شاعر تاریخ نویس بھی ہو۔ ۲۰۱۰ء میں سلیم شہزاد نے ''تاریخ ضلع بہاول نگر—معدوم سے معلوم تک'' لکھ کر یہ کارِ نمایاں بھی سرانجام دے ڈالا۔

تاریخ کی کتاب لکھ کر نثر کے میدان میں آئے تو ایک اُور کمال کر دِکھایا اور وہ

کمال ہے ناول نگاری۔ اُنھوں نے پچھلے کچھ عرصے سے ملک وقوم کو درپیش حالات کے تناظر میں سرائیکی زبان میں ''گھان'' کے عنوان سے ناول لکھا جو ۲۰۱۲ء میں ملتان سے اشاعت پذیر ہوکر قارئین کے سامنے آیا تو اِس نے سرائیکی کے ادبی حلقوں کی توجہ فوراً اپنی جانب کھینچ لی۔ ''گھان'' کو ۲۰۱۲ء کے قومی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ سلیم شہزاد کی اگلی منزل ٹھیری ایکِ اَور سرائیکی ناول: پَلُوتا۔ پلوتا کے معنی ہیں بَد دُعا۔ سرائیکی زبان کو نئے اُسلوب اور نئے متن سے تو وہ اپنے پچھلے ناول ''گھان'' ہی میں متعارف کروا چکے تھے لیکن ''پَلُوتا'' میں اُنھوں نے مزید آگے کی طرف قدم بڑھائے ہیں۔ ایک ایسے گھمبیر مسئلے کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرانے کی سعی کی ہے جو سب کے سامنے ہے لیکن سب نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اِس سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

نجم الدّین احمد

بہاول نگر

۳۰ اپریل، ۲۰۱۹ء

رَوایت ہے کہ اُس کے مُنہ سے درد بھری چیخ کے ساتھ ہی بَد دُعا بھی نکلی۔ بَد دُعا کیا تھی؟ کس نے دی تھی؟ اِس بارے میں کسی کو کچھ نہیں پتا تھا۔

......❖......

غصّے اور بے بسی سے اُس کے مُنھ سے کف بہہ رہا تھا۔ اُس کے بس میں ہوتا تو وہ سب کچھ آج ہی لکھ ڈالتا۔ بے بس آدمی کی زندگی بے معنی ہوتی ہے۔ آدمی اِتنا بے بس بھی ہوسکتا ہے کہ جو لکھنا چاہے لکھ نہ سکے؟ دماغ میں سب کچھ ہو لیکن قلم پر اپنا اختیار کھو بیٹھے؟ وہ وہاں سے لوٹنے کے بعد ایک لفظ بھی نہیں لکھ پایا تھا۔ وہ بے چارگی کے عالم میں گھر سے نکلا تو اُس کا ایک قدم کہیں تو دُوسرا کہیں پڑ رہا تھا۔ لیکن چلتا رہا، چلتا رہا...... یہاں تک کہ وہ چولستان کے مقابل آ گیا جہاں چہار جانب رَیت ہی ریت ہے۔ سامنے سے آنے والا اَیک اُونٹ اپنا سر اُٹھا کر آسمان کو تک رہا ہے۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ اللّٰہ سے مینھ مانگ رہا ہو۔

آسمان سے دُھوپ کی بارش برس رہی تھی جس کی ہر بُوند اُس کے بدن میں خار کے مانند چبھ رہی ہے۔ اُس نے آسمان کی جانب دیکھا جہاں بادل چھائے ہُوئے ہیں۔

''پھر یہ دُھوپ کی برسات......؟'' اُس نے سوچا۔

اُسے اب کسی بات کی پروانہیں رہی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے لیکن وہ چلتا رہا۔ اُونٹ کا مُنھ اب بھی آسمان کی سمت اُٹھا ہُوا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی نے ہَوا کو دبوچ لیا ہو۔

''ہَوا کہاں چلی گئی ہے؟ اِس جگہ پر تو ہمیشہ ہوتی تھی چاہے گرم ہی ہوتی۔ ہَوا نے کہاں جا کر بسرام کرلیا ہے؟ قید خانے میں یا......!!''

اُس کی مُٹھّی بھِنچی ہُوئی ہے اور وہ چلتا جا رہا ہے۔ رَیت کے اُس میدان میں جہاں وہ اور رَیت دونوں اکیلے ہیں۔

''رَیت بھی تو چھِن سکتی ہے؟''

''چھِن نہیں سکتی، چھن گئی ہے۔''

''پھر میں رَیت پر کیسے چل رہا ہوں؟''

''میں بھی تو چھِن ......یہ......تم تو مدت سے......تمھاری سوچ......'' اُس کی مُٹھّی سے رَیت گرنے لگتی ہے تو وہ اپنی مُٹھّی کھول دیتا ہے۔

رَیت سے بھری مُٹھّی، رَیت میں......

......❖......

اِس بات سے وہاں کے تمام باسی آگاہ تھے کہ پنج ہزاری کی ایک کونپل کھانے والے کی سات نسلیں بامُراد ٹھیرتی ہیں۔ اِسی بناء پر ہمیشہ ایسے سودائیوں کی کمی نہیں رہی تھی جو کسی نہ کسی طرح اُس کی ایک کونپل ضرور کھانا چاہتے تھے تاکہ وہ اور اُن کی نسلیں اپنی مُرادیں پا سکیں۔ لیکن کونپل کھانے کی شرط تھی کہ وہ ایسی کونپل ہو جو موسمِ بہار کے پہلے روز، رات کے آخری پہر میں اپنے آپ ،گرنے والی پہلی کونپل ہو۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید ہی کسی کو آج تک ایسی کونپل کھانے کا موقع ملا ہو۔ البتہ ایک مردِ پیر نے اِتنا ضرور بتایا تھا کہ وہ لگاتار سات برس تک ایسی کونپل کی خاطر اُس پیڑ کے پھیرے لگاتا رہا لیکن اُن سات برسوں میں اُس نے کبھی کوئی پتا نیچے ،گرتے نہیں دیکھا۔ ایک اَور بُوڑھے نے بتایا کہ اُس نے اپنی ساری زندگی میں کبھی اُس درخت کا کوئی پتا سُوکھتے دیکھا نہ ہی ،گرتے۔

موسمِ خزاں میں بھی وہ اکیلا پیڑ ہوتا تھا جس کے پتّے نہ ،گرتے اور نہ سُوکھتے تھے۔ کچھ ضعیف العمر بُوڑھے تو یہاں تک کہتے تھے کہ اُنھوں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ پتا جُوں

ہی نیچے گرنے لگتا تو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی اُسے ہَوا کھا جاتی۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ اگر چہ کبھی کسی انسان نے کونپل نہیں کھائی لیکن ہَوا تو کھا لیتی ہے، اسی لیے لوگ نہ ہی ہَوا تو بامُراد ہے۔ اِس بات پر اکثر لوگ پیچ و تاب کھانے لگتے کہ بھلا کبھی ہَوا بھی بامُراد ٹھیری ہے؟ یہ روایتیں سب کی گھٹی میں میں کچھ اِس طرح رچ بس گئی تھیں کہ ایک کونپل کھانے کا مطلب ہے آس پُوری ہُوئی۔ لیکن کوئی بھی شخص یقین سے یہ دعوٰی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی نے کبھی کونپل کھائی ہے۔

پنج ہزاری کے بارے میں پانچ ہزار مثالیں تھیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ گرتے ہُوئے پتّے کو ہَوا نہیں کھاتی بل کہ خُود پنج ہزاری اُسے ہڑپ کر جاتا ہے۔ وہ گرنے والے پتّے کو اپنی زوردار سانس سے اپنی طرف کھینچتا اور پھر وہ پتّا بھی پنج ہزاری کے دُوسرے پتّوں میں سے کسی ایک کے ساتھ چمٹ کر اُس کا حِصّہ بن جاتا۔

...... ❖ ......

کہنے کو تو وہ محض ایک پیڑ تھا لیکن ایک ایسا انوکھا اور منفرد پیڑ جس کی اِتنی بڑی بڑی داڑھی تھی کہ زمین پر بچھی رہتی تھی۔ اُس کا تنا، شاخیں اور پتے سبھی کچھ عجیب و غریب تھا۔ اُس جیسا قرب و جوار تو درکنار پُوری دُنیا میں کوئی درخت نہیں تھا۔ اُس کا اکرام واحترام یُوں کیا جاتا تھا جیسے وہ وہاں کا سب سے بڑا بزرگ ہو۔ گھر کا ایک ایسا بزرگ جس کا رعب داعب اب بھی جُوں کا تُوں قائم دائم ہو۔

بستی والوں کا خیال تھا کہ پنج ہزاری اُن کی تمام باتیں سنتا ہے؛ اُن کے بارے میں ہر چیز اور ہر بات کا اُسے اِس طرح پتا ہے جیسے وہ اُن کا رکھوالا ہو۔ وہ صرف ایک درخت نہیں ایک ایسا بڑا ہے جو ہر چیز جانتا ہے یا پھر ایک ایسی بزرگ ہستی جس نے ہزاروں برس قبل پیڑ کی جون اختیار کر لی ہو۔ یہ یقین بھی روایت کا حِصّہ تھا کہ پنج ہزاری تو محض ایک پیڑ ہے لیکن اُس کے کشادہ گھیر میں ہزار ہا سالوں سے کوئی اللّٰہ والا قیام پذیر ہے جس کی وجہ سے وہ آج بھی صحیح سالم کھڑا ہے۔ خیر، جتنے مُنھ اُتنی باتیں۔ البتّہ یہ بات سب ہی کہتے تھے کہ ہم اُسے جب سے دیکھ رہے ہیں ویسے کا ویسا پڑا ہے اور یہی بات ہمارے آباء واجداد بھی کہتے تھے۔

……❖……

''میں جب تک سچ نہیں لکھ لیتا، لکھتا رہوں گا چاہے مجھے اپنے لکھے ہر کاغذ کو پھینکنا ہی پڑے۔''

''آج میں سچ لکھ کر ہی رہوں گا۔''

''ہر کسی کا اپنا سچ ہوتا ہے۔''

''سب سچ ہی لکھتے ہیں۔''

''لکھتے ہوں گے لیکن مجھے ایک ایسا سچ لکھنا ہے جسے میں اپنے دِل پر بوجھ کے مانند اُٹھائے پھِر رہا ہوں...... جب سے مجھے اُس سچ کا پتا چلا ہے میں سو نہیں پایا...... میں سچ کی امانت اپنے ساتھ ساتھ لیے پھِر رہا ہوں جسے لوگوں تک پہنچانا میرا فرض ہے...... اگر میں اِسے نہ لکھ پایا تو وہ مجھے اور میری نسلوں کو معاف نہیں کرے گا...... اُس نے یہ امانت میرے حوالے کرتے ہُوئے مجھے تنبیہ کی تھی کہ اِسے ہر حال میں سامنے لے آؤں ورنہ...... جُھوٹ ہمیشہ سچ ہی کہلاتا رہے گا......!''

''سچ کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔''

''مسئلہ سہل، مشکل کا نہیں۔ بات اُس تاریخی سچ کی ہے جس کے ساتھ میری نسلیں......!''

''جو ہو سو ہو، اگر میں اِسے نہ لکھ سکا......تو پھر رہتی دُنیا تک کوئی نہیں لکھ پائے گا۔''

......❖......
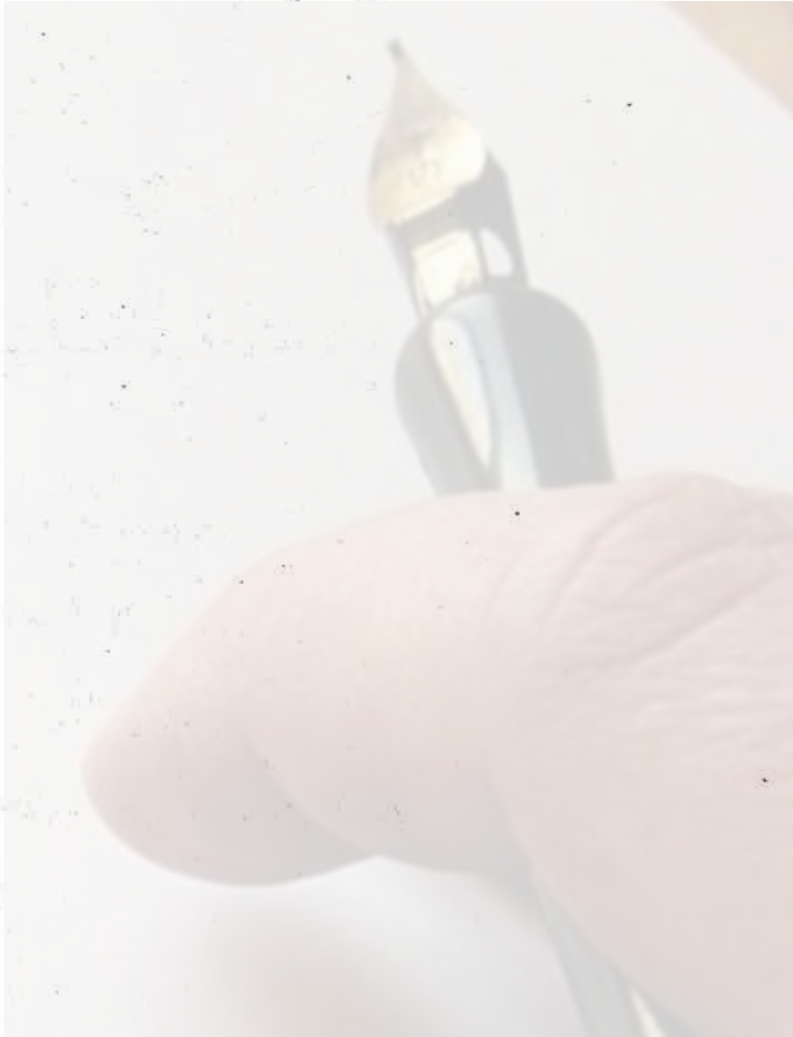
یُوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی اندھا کنواں ہے اور اُس کے اندر کاغذوں کے ٹکڑوں کا— پُورے اور اَدھ لکھے ہُوئے ٹکڑے، پرچیاں اور پتا نہیں کیا کیا— ایک ڈھیر اُس کے اندر بھرا پڑا تھا۔ اِتنا کچھ تھا جیسے کوئی صدیوں سے لکھ لکھ کر اُس کے اندر پھینکتا گیا ہو۔

''میں نے اِنھیں سنبھالا ہے، نہ سنبھالتی تو یہ سب کچھ بکھر گیا ہوتا۔

''میرے ساتھ کبھی اچھا سلوک رَوا نہیں رکھا گیا پھر بھی میں نے کبھی اِنھیں رُلنے نہیں دیا۔

''کئی بار زِچ ہُوئی، سوچا کہ نہ سنبھالوں تو کوئی میرا کیا بگاڑ لے گا۔'' وہ بولی۔

''اُسے تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ تو کل کا بچّہ ہے میں تو اُس کے دادے پڑدادے کو بھی جانتی ہوں۔ اُسے کیا پتا!''

''تیرا کام یہی تھا، تُو نہ کرتی تو تیری جگہ کوئی اَور کرتا۔''

''ہوگا، ضرور ہوگا۔ میں تو نہ ہوتی۔''

''تیرے جِد ہوتے۔ تمھارا یہی کام ہے اور اِسے تم ہی نے کرنا تھا۔''

''ہم کیوں کرتے؟ ہمارا صرف یہی کام تو نہیں، اَور بھی ہیں۔''

''تمھیں اِس کام کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔''

''نہیں، ہمیں تم نے بنایا تھا؟''

''ٹھیک ہے، میں نے نہیں بنایا۔ میرے کسی بڑے نے تمھیں بنایا تھا، آخر کچھ سوچ سمجھ کر ہی بنایا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، جس نے بھی بنایا، بنا دیا۔ لیکن وہ ہمارا خیال بھی تو رکھتے تھے۔ تمھیں تو لکھ لکھ کر پھاڑ پھینکنے کے علاوہ کوئی کام آتا ہی نہیں۔''

یہ کہہ کر اُس نے سامنے دیکھا تو وہاں خاموشی کے سِوا کچھ نہیں تھا۔

اُسے پریشانی لاحق ہوگئی کہ وہ کس سے باتیں کررہی تھی؟ اپنے آپ سے......؟

......❖......

تلواریں چل رہی ہیں۔ لوگ مر رہے ہیں۔ ایک دُوسرے کے گلے کاٹ کاٹ کرزمین پر پھینکتے جا رہے ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ اپنی تلوار سے دُوسرے کی گردن اُتار ڈالے۔ نیزے بھونکے اور چلّوں پر چڑھے تیر چھوڑے جا رہے ہیں۔ شدّت اِتنی زیادہ ہے گویا ایک دُوسرے کو ختم کرنا ضروری ہو۔ بڑے مُنھ والے کے بازو پر اِتنے زور کی تلوار لگی کہ اُس کے بازو کے ساتھ ساتھ اُس کے گھوڑے کی گردن بھی ٹُوٹ گئی۔ چاروں جانب گھوڑے، تلواریں، ڈھالیں، نیزے، بھالے یُوں چل رہے ہیں جیسے اگر آج دھرتی پر خُون نہ بہا تو زمین نہیں بچے گی۔ لہو کی نہروں میں مرتے ہُوئے لوگ گر رہے ہیں۔ کسی کو کسی کا لحاظ نہیں رہا۔ سب اپنے آپ کو بچانے کے لیے دُوسرے کو مارنے میں جُتے ہُوئے ہیں۔ تلواروں کو سانس لینے کا موقع تک نہیں مل رہا۔ چوگرد شور ہی شور...... چیخ وپُکار...... آہ و بکا...... بچّوں کے رونے کا غوغا...... شورشرابا...... مائیں پاگل ہو گئی ہیں...... جارحو...... جارحو...... کیوں مار رہے ہو...... خدا تمھیں غارت کرے...... اگر...... ہم مرے...... تم بھی

نہیں بچو گے...... قہر نازل ہو گا...... تم پر...... ظالم نہ بنو...... اماں...... ابّا...... کہاں......
ہو...... ہمارا قتل کیوں کرتے...... ہو...... یہ کون ہیں...... ہم نے کچھ نہیں کیا...... پھر......
بھی...... یہ نہیں بچیں گے...... کسی کو کسی خبر نہیں...... مارنے والے طاقت وَر ہیں...... مار
رہے ہیں...... کیوں؟

دھرتی خُون اور لاشوں سے اَٹی پڑی تھی اور تیروں، تلواروں سے بچتے بچاتے،
دوڑتے بھاگتے لوگوں کا پیچھا بہت سے گھڑسوار حملہ آور کر رہے ہیں۔

دڑ دڑ دڑ...... ایک طرف سے ایک نیا جتھا گھوڑے دوڑاتے ہُوئے آرہا ہے......
گھوڑے آرہے ہیں...... گھوڑے...... آرہے...... ہیں...... گھو......ڑ...... ے...... آ......
ر...... ہے...... ہیں...... بس...... آ...... ئے...... آنے...... والوں...... کو...... آنے......
والے...... کو...... رو...... ک...... نے...... وا...... لے...... کہاں...... آ...... گئے......
ہیں...... دھ...... ھا...... ڑ...... د...... ھا...... ڑ...... کو...... ن...... اِ...... لے...... ن......
ک...... ی...... و...... ل...... آ...... ء...... ے...... ہم...... ہم...... ے...... یں......
بَین...... فریاد...... مرد...... غلام...... عورتیں...... باند...... یاں...... لُوٹ...... مار......
کیا...... ہو...... گیا...... سب...... بدل...... گئے...... مگر...... کیوں...... ہم...... حملوں......
کے...... لیے...... پیدا...... ہُوئے...... ہیں...... ہم...... ا...... ری...... آواز...... ختم......
ہو...... جائے...... گی...... یہاں...... کوئی...... اَور...... نسل...... پیدا...... ہو...... گی...... کوئی
اَور......!!

......❖......

اُس کا نام ہی بس دربار رہ گیا تھا ورنہ اب اُس میں مزار والی کوئی بات نہیں بچی تھی۔ ایک چھوٹے سے احاطے میں ایک درخت کے نیچے ایک قبر اور قبر کے اُوپر جھاڑ جھنکاڑ کی چھت۔ لوگوں نے ڈھینگریاں ڈال کر اپنی طرف سے اُس چھت کو اپنے تئیں پختہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ چار دِیواری کے نام پر ایک ٹُوٹی پُھوٹی دِیوار تھی۔ قِصّہ مختصر اُس دربار کی حالت خستہ تھی۔ لگتا تھا جیسے وہاں لوگ بھی کم آتے ہوں۔ لیکن نشانیاں، کسی زمانے میں اُس کے ایک بڑا مزار ہونے کی چغلی کھاتی تھیں۔

مزار کے احاطے کے باہر دُور دُور تک سنسانی اور خوف ناک ویرانہ تھا۔ جس میں اُس کی بکھری ہُوئی پختہ اینٹوں اور رَوڑوں سے یہ قیاس ہوتا تھا کہ وہ اپنے وقت کا عالی شان دربار رہا ہوگا۔ جہاں شب و روز لوگ کا جمِ غفیر زیارت کے لیے آتا، قیام اور عبادت کرتا ہوگا۔ دس جاتے بیس آتے ہوں گے۔ لنگر کا بھی عمدہ انتظام ہوگا۔ مزار کا باقاعدہ خیال اور اِسے صاف ستھرا رکھا جاتا ہوگا۔ لوگ منتیں مانگتے، چڑھاوے چڑھاتے ہوں گے۔ لیکن

اب اُس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ شاید وقت نے اُس کا یہ حال کر دیا تھا۔ دربار، اب دربار نہیں ایک اجڑا اجڑا گھر تھا۔ جہاں اب صرف جُوئیں اور لِیکھیں بستی تھیں۔ اپنی شان و شوکت اور عظیم ماضی کی یاد میں ایک اُداس اور افسردہ مقام جس کے حزن و ملال نے چاروں طرف کے ماحول میں سنسانی اور یاسیت بھر ڈالی تھی۔

بستی سے ملحق ہونے کے باوجود اُس کے آس پاس، جہاں تک اُس کی ٹوٹی پھوٹی اینٹیں بکھری ہوئی تھیں، ایک بھی مکان نہیں تھا۔ بستی والوں میں جہاں اُس کے عظیم الشان ماضی کے قصّے لوک داستانوں کی طرح مشہور تھے وہیں بہت سے اوہام بھی۔

روایت تھی کہ کسی نے اُس مزار کے قریب بسنے یا اُس کی جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو اُس کا خاندان ویسے ہی تباہ و برباد ہُوا جیسے وہ خُود نشانِ عبرت بنا کھڑا تھا۔ اِس لیے لوگ اُس سے کنارہ ہی رکھتے تھے۔

کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کا مزار ہے اور کس عہد میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ رات کے وقت وہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ دِن کے اُجالے میں بھی لوگ وہاں محض اپنی مُراد مانگنے آتے اور رَات پڑنے سے پہلے روانہ ہو جاتے۔

اب وہاں ٹوٹی پھوٹی چہار دِیواری کے اندر بُھرتی ہُوتی اینٹوں کا ایک کم بلند چبوترہ تھا اور کافی عرصہ پہلے ٹوٹ جانے والی ہتھی کا دستی نَل۔ سامنے کے رُخ مسطح جگہ تھی جس سے ذرا سا آگے ایک پُرانا جھونپڑا جس کا کوئی مکین نہیں تھا۔ لوگوں بتاتے تھے کہ آدھی رات بیتنے پر وہاں کچھ آدمی آتے اور صبح سویر رخصت ہو جاتے تھے۔

نَل کے خشک ہونے کے بعد جھونپڑے کے باہر کسی نے ایک پُرانا سا گھڑا اور مٹّی کا آب خورہ لا کر رکھ دیا تھا تا کہ وہاں سے گذرنے والے مسافر اپنی پیاس بجھا سکیں۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کب اور کون اُس گھڑے کو پانی سے بھر جاتا تھا۔

اُس کے دِل میں کئی مرتبہ اُس دربار میں جانے کا خیال آیا لیکن وہ ہر بار اپنے اِس خیال کو جھٹکتا رہا۔ وہ درباروں مزاروں کو سرے سے ہی نہیں مانتا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھار اُس کے دِل میں وہاں جانے کی تمنا سر اُٹھاتی۔

وہ خُود بھی اپنی اِس خواہش پر حیران ہوتا کہ کہ جب وہ درباروں مزاروں کو مانتا ہی نہیں تو اُس کے اندر یہ اُمنگ اُٹھتی ہی کیوں ہے۔ اُس نے ہزار ہا تاویلیں گھڑیں اور سبب تلاشنے کی سعی بھی کی۔ شاید اِس کی وجہ یہ نہ ہو کہ وہ اُنھیں سرے سے مانتا ہی نہیں ہے، یا یہ وجہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ بستی دو دھڑوں میں منقسم ہے: ماننے اور نہ ماننے والے؟ یا پھر جھوٹی سچی روایتیں؟

ماننے اور نہ ماننے والے دونوں ہی وہاں سے اپنی مُرادیں پاتے یا پھر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اُس کی اپنی متجسس طبیعت اُسے اُکساتی رہتی تھی یا وہ وہاں جا کر اُس مزار کا کوئی کھوج ڈھونڈنا چاہتا تھا کہ پتا چل سکے اُس کی اصل حقیقت کیا ہے جو زمانے کی دُھول تلے دب چکی ہے یا پھر خُود صاحبِ دربار اُسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا؟ وہ جتنا غور کرتا اُلجھی ہُوئی تاریخ کے مانند اُتنا ہی اُلجھتا چلا جاتا۔

......❖......

رات کے پچھلے پہر اُس کی آنکھ کھلی تو اُسے لگا کہ وہ درخت کی جون اختیار کر گیا ہے اور پتّوں اور نسوں سے جُڑے ہُوئے اُس کے ہاتھ ہل رہے ہیں۔ اُس کی آنکھیں دوبارہ اپنے آپ مندنے لگیں۔

روایت ہے کہ پنج ہزاری کے پتّوں میں سے نوزائیدہ کونپلیں رگرتی تھیں۔ سانپ کی پھنکار سے اُس کی آنکھ کھلتی ہے۔ ایک ناگ اپنی بانبی میں گھس رہا ہے اور پیڑ سے جمعرات کی گھٹا نیچے اُتر رہی ہے۔

جمعرات کی گھٹا کو چھائے ہُوئے آج ساتواں دِن ہے لیکن بارش کے قطرے زمین پر نہیں پیڑ پر رگر رہے ہیں۔ پیڑ بُوندوں کی ہم آغوشی پا کر مسرت سے نہال ہے۔

شاید یہ آخری جھڑی ہو۔ ہر جھڑی آخری ہوتی ہے اور پہلی بھی، لیکن جمعرات کی......جھڑی......

آج آٹھواں دِن ہے۔ مینھ نہیں برسا اور گھٹاؤں کی توُں موجود ہے۔

آج وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا نہ لکھنا لیکن پھر بھی اُس کا دِل چاہ رہا تھا کہ وہ آج اُس سچ کو ہر حال میں لکھ کر رہے۔ اُس نے افسردگی سے قلم اُٹھایا اور سپاٹ آنکھوں اور خالی الذہنی کے عالم میں سامنے والی دِیوار کو تکنے لگا۔ اُسے کسی چیز کے نیچے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے دھیان میں اِتنا غرق تھا کہ اُس نے اُسے اپنا وہم سمجھا۔

''آج کچھ نہ کچھ تو لکھنا چاہیے۔'' اُس نے سوچا لیکن قلم چلنے کا نام نہیں لے رہا تھا نہ ہی اُس کے دماغ میں کوئی ایسی بات آئی جسے وہ لکھ سکتا۔ بس اُس کی نگاہیں سامنے والی دِیوار پر گڑی ہوئی تھیں اور دِیوار اُس کے ذہن کی طرح خالی تھی۔ اُس نے اضطراری عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا کہ شاید کوئی انوکھا خیال سُوجھ جائے اور وہ اُس کے بتائے ہُوئے سچ کو ایسے پیرائے میں لکھ سکے جو لوگوں کے دِل و دماغ میں اُتر کر اپنا گہرا اثر دِکھائے۔ لوگ اُس کی تحریر کو بکواس نہ گردانیں۔ بَل کہ وہی سچ مانیں جو اُس نے اُسے بتایا تھا۔ گو اُسے یہ کارِ دُشوار لگ رہا تھا لیکن کرنا تو تھا۔ آخر اُس کو تنبیہ کی گئی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک بار پھر اُسے کسی چیز کے نیچے گرنے کی آواز آئی۔ آواز اِتنی دِھیمی تھی کہ اُس نے اُس پر توجہ نہ دی۔ وہ سوچوں میں کھویا ہُوا کمرے سے باہر نکلا۔ باہر کا نظارہ پہلے جیسا ہی تھا۔ لیکن کاغذ کا

ایک مُڑا تُڑا گولا، جو اُس نے اُس کے شکم میں پھینکا تھا، نیچے پڑا تھا۔ اُس نے بے دھیانی میں اُس گولے کو اُٹھایا اور پڑھے بغیر دوبارہ وہیں پھینک کر کمرے کی جانب چل دیا۔

اُس نے قلم اُٹھایا اور سامنے رکھے کاغذ پر لکھنے لگا۔ اُس نے ایک کاغذ پورا کر کے دُوسرا اُٹھالیا۔

''یہ...... یہ...... تو میں نے نہیں لکھا۔ لکھائی تو میری ہی لگتی ہے لیکن میں نیلی روشنائی سے لکھتا ہوں۔ لال روشنائی سے لکھا ہُوا یہ کاغذ یہاں کس نے رکھا ہے؟'' وہ کانپ اُٹھا۔

''کیا وہ مجھے بتائے ہُوئے سچ کو خُود ہی لکھ لکھ کر مجھے بھیجنے لگا ہے؟ میں نے خُود ہی تو اِسے نیند میں نہیں لکھ لیا؟ لیکن یہ تحریر......؟ یہ میری لگتی ہے......'' وہ شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ ''اور میری نہیں بھی...... پھر آخر کس نے لکھا ہے؟ اُس نے میرے سونے کے دوران میں میرا ہاتھ پکڑ کر تو نہیں لکھ دیا؟ میرے وجود کو اپنے فسوں کا اسیر کر لیا ہو؟ میرے دماغ میں گھس کر مجھ سے یہ سب لکھوالیا ہو؟''

اُس کے دل میں افسوس بیٹھ گیا۔ اُس نے اب تک کاغذ پر صرف نظر ڈالی تھی پڑھا نہیں تھا کہ اُس کے بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو تسلّی دی۔ ''اگر وہ خُود یہ سب لکھ سکتا یا اِس طرح کسی سے لکھوا سکتا تو مجھے کیوں بتاتا۔ لکھنے کے لیے بھی تو اُسی نے مجھ سے کہا تھا۔ پھر یہ کاغذ کس نے لکھے؟ کون ہو سکتا ہے؟ کیا میں خُود......؟'' اُس کا دماغ سوچوں کی دُھند میں اُترتا چلا گیا۔

......❖......

''میں کب تک اِس کا بوجھ اُٹھاؤں۔ پل بھر کے بعد تو یہ میرا شِکم مُڑے تُڑے کاغذوں سے بھر ڈالتا ہے۔'' کاغذ کا گولا اُس کے اندر گرتے ہی اُس کے اندر سے یہ پُکار نکلی۔ ''لیکن یہ قضیہ آج کا تو نہیں ہے، یہ تو ہر منٹ کے بعد یہی کام کرتا ہے۔ ویسے یہ لکھ کیا رہا ہے کہ ابھی ایک کاغذ کی روشنائی خشک نہیں ہوتی اور وہ اُس کا گولا بنا کر میرے شِکم میں ٹھونس دیتا ہے؟''

''کئی برسوں سے یہ یہی کرتا آ رہا ہے۔ اِس نے آج تک اپنے لکھے ہُوئے ایک کاغذ کو بھی نہیں سنبھالا۔ اگر اچھا نہیں لکھ سکتا تو مردود لکھتا ہی کیوں ہے؟ لگتا ہے میرا بوجھ بڑھانے کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے؟ آدمی کو جو کام نہ آتا ہو اُسے کرنے کی کوشش کا فائدہ؟ نہ کرا ایسا کام جس سے دُوسروں کو تکلیف پہنچے۔ میں نے اِس کی لکھتوں کو آج تک پڑھا بھی تو نہیں کہ کیا لکھتا ہے؟ پڑھ کے بھی کیا کروں؟ اِدھر اُدھر کی ہانکتا ہوگا، تبھی تو پھینکتا ہے۔ اگر کوئی اچھی چیز لکھتا تو سنبھال کر نہ رکھتا۔ پڑھنے کے قابل چیزیں تو چھپتی ہیں جیسے اِس کے چھپی ہُوئی بھاری بھاری کتابیں ہیں جن میں یہ دِن رات جتا رہتا ہے۔ لگتا ہے جو پڑھتا

ہے ویسا ہی لکھنا چاہتا ہے اور جب نہیں لکھ پاتا تو میرا پیٹ بھرنے لگتا ہے۔ حیا نہیں آتی! مجھے عذاب میں ڈالا ہُوا ہے۔ ٹھونستا ہی چلا جا رہا ہے میرے چھوٹے سے شکم میں۔ مجھے تو یہ بے چارہ خُود عذاب میں پڑا ہُوا لگتا ہے۔ دیکھو تو سہی، کیسے بے چینی سے ٹہل رہا ہے، قرار ہی نہیں آ رہا۔ بے چارہ عذاب جھیل رہا ہے، جسے ہاتھ کے ساتھ قلم باندھے پھرتا ہو......!

''لگتا ہے نہ لکھ سکنے کے عذاب میں ہے......!!!''

...... ❖ ......

پچھلے دھاوے کے وقت پنج ہزاری کی شاخوں میں چھپ کر جان بچانے والے حملہ آوروں سے بچتے بچاتے قرب و جوار کی بستیوں میں چلے گئے تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف دُوسری بستیوں والوں کو خبردار کیا بل کہ اُن حملہ آوروں کے بارے میں بہت سی وہ باتیں بھی بتائیں جس کے وہ خُود چشم دِید تھے۔ یہ بھی بتایا کہ اگر وہ پیڑ نہ ہوتا تو وہ کبھی نہ بچ سکتے۔ اُن کی وجہ سے آس پاس کی بستیوں والے چوکنّا ہو گئے۔ یہ بات درست تھی یا غلط، اِس کا تو نہیں پتا البتہ اُس بستی کے تمام بزرگ اِسے سچ مانتے اور اِسی لیے پنج ہزاری کی قدر کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ پنج ہزاری اُن کا محبّ اِس لیے ہے کہ اُس درخت کو ہزاروں سال پہلے اُس بستی کے بڑے بُوڑھوں نے اپنے ہاتھ سے نہ صرف لگایا بل کہ اُسے پالا پوسا بھی اور اُسے طوفانِ بادوباراں سے بھی بچاتے رہے۔ کسی کو اُس کی اصل عمر کا پتا نہیں تھا لیکن وہ پنج ہزاری کے نام سے مشہور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پنج ہزاری اُن لوگوں کا ممنون تھا۔

......❖......

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ پنج ہزاری کے اندر کوئی بزرگ ہستی نہیں جن رہتے ہیں۔ لوگ اُس مقام پر جانے سے خائف بھی رہتے اور اُس کا احترام بھی کرتے تھے۔ اور اُسے مقدس بھی سمجھتے تھے۔ جن یا بزرگ کی مکانیت کا خیال محض اُن لوگوں کا تھا جو وہاں کے اصلاً نسلاً باسی نہیں بَل کہ کسی اَور مقام سے آ کر وہاں بس گئے تھے۔ ویسے بھی دُوسری جگہوں سے آ کر بسنے والے لوگ پنج ہزاری سے مخاصمت رکھتے تھے۔ لیکن وہاں کے اصلی باشندے پنج ہزاری کو مقدس مانتے، اُس کا اکرام کرتے اور اُسے اپنا رکھوالا سمجھتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ ایک روز وہی غیروں سے اُن کی جان چھڑوائے گا کیوں کہ وہ ابھی تک اُن کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہے۔ 'اتوار کے دربار' سے بعینہٖ اُن کی آس اُمید ختم ہُوئے مدت ہوگئی تھی جیسے خُود وہ مزار اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

وہاں کے باسی یہ بات بالکل تسلیم نہیں کرتے تھے اور وہ کسی بھی خوف کی وجہ سے اُس مقام سے ہر وقت آس لگائے رکھتے تھے اور کچھ لوگوں کے کسی اندرونی گوشے میں یہ ڈر چھپا بیٹھا تھا۔

جمعرات کی گھٹا کی اپنی جگہ جُوں کی تُوں موجود تھی اور لوگ گھٹا کا زور توڑنے کے لیے جتن کر رہے تھے۔

ایک بُڈّھے کا خیال تھا کہ پنج ہزاری کی وجہ سے وہاں کے باسی بے شمار مشکلات اور مصائب سے بچے ہُوئے ہیں۔ لیکن غیر باشندے اِس خیال کے منکر تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہاں کے حکمران نے جو حال 'اتوار کے دربار' کا کیا تھا، اگر وہی حال پنج ہزاری کا بھی کیا ہوتا تو آج ہم مصیبت سے محفوظ ہوتے۔

اصل باشندوں نے دوبارہ وطن میں اپنی شان وشوکت پانے کے بعد اب ایک بار پھر سر اُٹھا لیے تھے۔ جس کا سبب وہ اُس پیڑ کو سمجھتے تھے۔ لیکن غیر باشندے پنج ہزاری سے اِس لیے خوف کھاتے تھے کہ طویل مدت تک کسی درخت کا اپنی اصلی حالت میں قائم ودائم رہنا ناممکن ہے۔ ہر شخص اِس بارے میں مختلف رائے رکھتا تھا۔

......❖......

وہ دُنیا کی آخری رات لگتی تھی۔ اُسے رات کہتے ہُوئے دِل کانپتا اور لوگ اُس رات کے بارے میں بات کرنا تو درکنار سوچنے سے بھی ڈرتے تھے۔ اُس رات لوگوں کو یُوں لگ رہا تھا جیسے زمین کا، جسے وہ اپنا گھر سمجھتے تھے، بالآخر وہ لمحہ آ پہنچا ہے جسے آخری وقت کہا جاتا ہے۔ قیامت کا سا سماں لگتا تھا لیکن قیامت برپا نہ ہُوئی تو لوگوں کو احساس ہُوا جیسے یہ کوئی تنبیہ تھی؟ لیکن کس بات پر؟ اُن سے گُناہ سرزد ہو گئے ہیں؟ وہ ایسے کون سے کام کر بیٹھے جو یہ سب ہو رہا ہے؟

نصف رات کو دُنیا میٹھی نیند سو رہی تھی کہ لوگوں کے کانوں میں ایک ایسی تیز چیخ پڑی جیسے صُور پھُونک دیا گیا ہو۔ بہت سوں کے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور اُن سے خُون بہہ کر رُخساروں سے ہوتا ہُوا ٹھوڑی کے دونوں طرف پہنچ گیا۔ پھر لہو کی وہ لکیریں بُوندوں کی طرح جم کر فانوس کے موتیوں کے مانند چمکنے لگیں۔ اُن کے دماغ میں بہرے پن کی شاں شاں کی آواز گُونجنے لگی۔ اُنھیں لگا جیسے اُن کے کانوں میں چیخ کی سلائی پھیر دی گئی ہو۔ بس وہ لوگ بہرے پن سے سکے جنھوں نے آواز آتے ہی اپنی کانوں میں اُنگلیاں زور سے اِس طرح ٹھونس لیں کہ کوئی باہر سے کھینچتا تو بھی نہ نکلتیں۔ اُن کی پوریں کانوں کے پردوں کے ساتھ جُڑی ہُوئی تھیں۔

دہشت زدہ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر باہر کی جانب یُوں دوڑے کہ اُنگلیوں کی

پوریں اب بھی کانوں میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ ہر طرف قہر مچا ہوا تھا۔ سر پر آسمان اور پیروں تلے دھرتی لڑھکنیاں کھا رہی تھی۔ وہ ایک دُوسرے کو دھکے دیتے ہوئے یُوں بھاگ رہے تھے جیسے چیخ بَلا کا رُوپ دھار کر اُن کے تعاقب میں ہو۔

چیخ کیا تھی اور کیسی تھی؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ کوئی اُسے قیامت کہتا، کوئی دیو کی چنگھاڑ تو کوئی ڈائن کی تیکھی پُکار۔ کوئی اُسے گُونج گردانتا۔ کوئی کہتا کہ زمین پر کوئی بڑا استارہ آ کر گرا ہے جس کی گُونج سے سماعت جاتی رہی اور لوگ بہرے ہو گئے۔ کسی کا خیال تھا کہ ایک مرتبہ پھر دھاوا بولا جائے گا کیوں کہ غیر مقامی جارِح اُن کے لہو سے زمین کو لال کرنے کا سوچ بیٹھے ہیں۔ ہر آدمی اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قیاس کر رہا تھا لیکن حقیقت ہمیشہ کے مانند پردے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔

قیامت کی، اُس رات کا حال وہی بتا سکتے ہیں جن پر بیتی تھی، کسی دُوسرے کی سوچ کی رسائی وہاں تک ممکن نہیں۔ ہر شخص کی اُنگلیاں اُس کے کانوں میں تھیں اور زبانیں گُنگ۔ وہ کسی انسان، کسی ذی رُوح کی چیخ ہرگز نہیں تھی بس یہی روایت ہے کہ وہ کئی طرح کی تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی بھی اُسے کسی دیکھی، اَن دیکھی ہستی کے ساتھ نہیں جوڑ سکتا تھا۔ اُس رات کی چیخ کو بُھلایا بھی نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ وہ پھِرکی کے مانند لوگوں کے کانوں میں گھوم گئی تھی۔ کوئی ایک بھی اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہا تھا — مرد و زن، بچّے، لڑکے، لڑکیاں — اور یُوں لگتا تھا جیسے چیخ متواتر گُونج رہی ہو۔ کوئی اُسے ہَوا کی، تو کوئی آسمان کی اور بچّے اُسے کسی بَلا کی چیخ سمجھ رہے تھے۔ آدھی رات سے لے کر اگلا دِن چڑھنے تک لوگ اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسے گونگے بہرے بن کے پھِرتے رہے۔ لیکن ڈر پھر بھی اُن کے دِل میں گھر بنا کر بیٹھا رہا کہ وہ کیسی چیخ تھی جس نے پَل بھر میں ہنستے کھیلتے گھر اُجاڑ دیے۔

......❖......

راوی کم زور ہو تو روایت خُود بخود ضعیف ہو جاتی ہے۔ لیکن اُس نے تو یقینِ واثق سے یہ بات سنائی تھی کہ وہ وہاں سے گذر رہا تھا، اُس نے خُود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پیڑ کے اندر سے ایک سایہ نکلا اور ساتھ ہی پتّوں میں سے صرف ایک بُوند سیدھی اُس پرچھائیں کے اُوپر، گری، اور وہ سایہ کسی آدمی کا نہیں لگتا تھا۔

''کیا وہ کوئی انسان تھا؟''

''نہیں سایہ تھا۔''

''اکیلا سایہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم نے خُود دیکھا؟''

''جی ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

''میں اُس پیڑ سے تھوڑا سا پیچھے تھا کہ ایک سایہ اندر سے نکلا اور اُس کے نکلتے ہی ایک کونپل نیچے، گری۔''

''تم تو کہہ رہے ہو تم تھوڑا سا پیچھے تھے۔ تمھیں کونپل کیسے دِکھائی دے گئی؟''

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''تمھارا وہم ہے۔''

''نہیں، یار۔ وہم نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے۔''

''اگر یقین ہے تو وہ آدمی بھی تو دِکھائی دیا ہوگا جس کا سایہ تھا۔''

''آدمی؟ آدمی تو نہیں نظر آیا لیکن سایہ ضرور دِکھائی دیا تھا۔''

''یہ تو قطعاً نہ ماننے والی بات ہے۔ تمھیں دھوکا ہُوا ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔ شاید!''

......❖......
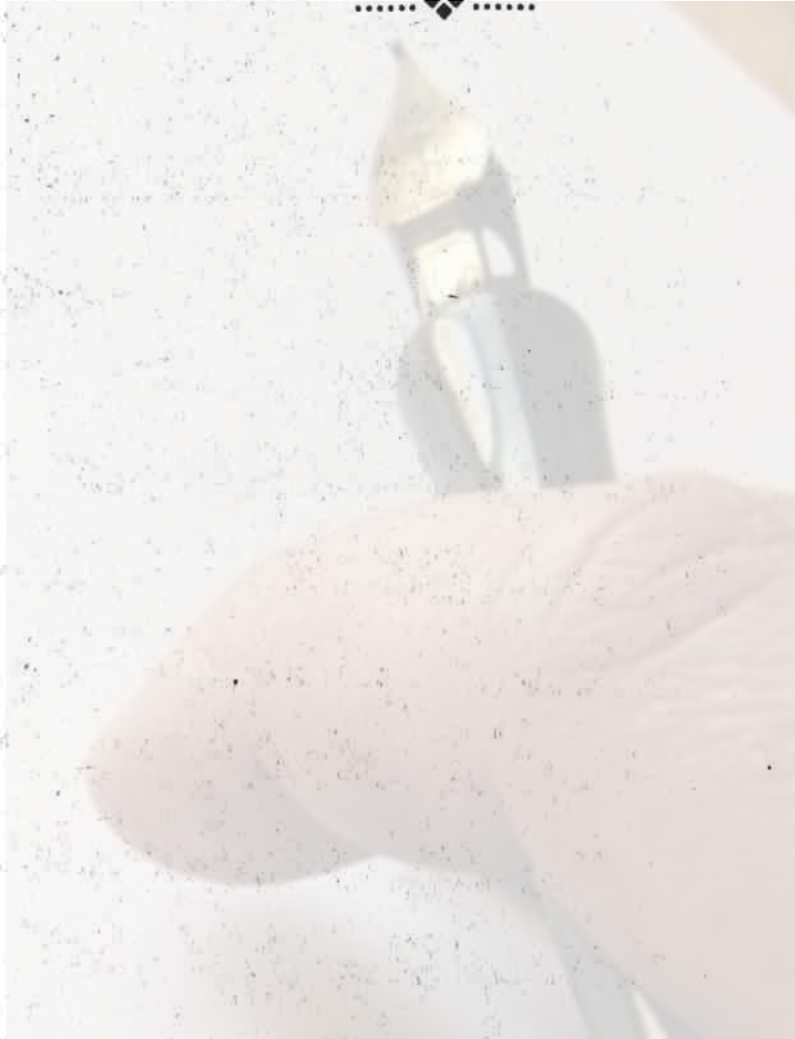
ایک بُڈّھے نے دُوسرے کو بتایا۔ ''میں نے کل رات کو پنج ہزاری کے پاس دو سائے دیکھے ہیں۔''

دُوسرا ہنستے ہُوئے بولا۔ ''یار، لگتا تم کچھ زیادہ ہی بُوڑھے ہو گئے ہو۔''

''نہیں، یار۔ میں سچ کہہ رہا ہوں لیکن تم نے میری مکمل بات سنی ہی نہیں۔ وہ سائے پُورے نہیں تھے۔ آدھے آدھے تھے اور ایک دُوسرے کے پیچھے چل رہے تھے۔''

''یار، تُو واقعی بُڈّھا ہو گیا ہے۔ تمھیں سائے دِکھائی دینے لگے ہیں اور وہ بھی آدھے آدھے۔'' اُس کی ہنسی تھم ہی نہیں رہی تھی۔ ''یار، وہ بھی آدھے آدھے؟'' وہ دوبارہ ہنسنے لگا۔ ''لگتا ہے تمھیں سراب دِکھائی دینے لگے ہیں۔''

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اُن کے سامنے سے دو سائے اِتنی برق رفتاری سے گذرے جیسے وہ سائے نہ ہوں ہَوا ہو۔

......❖......

''آج اندھیری رات ہے۔''

''راتیں اندھیری ہی ہوتی ہیں۔''

''ہوتی ہوں گی۔''

''لیکن آج کی رات گھور اندھیرا ہے۔''

''راتوں کو اندھیرا ہی ہوتا ہے۔ تمھیں نہیں پتا؟''

''پتا ہے۔''

''لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''مجھے یہ بہت کالی لگ رہی ہے۔''

''رات سفید بھی ہوتی ہے؟''

''نہیں ہوتی ہوگی۔ لیکن یہ زیادہ کالی ہے۔''

''تیرا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

''کیوں؟''

''مجھے لگتا ہے، کہیں کل کا دِن تاریک نہ نکلے۔''

''دِن کیسے تاریک ہوسکتا ہے؟''

''ہوسکتا ہے۔ اگر اُس کے اندر رَات کا چھینٹا پڑا ہُوا ہو۔''

''دِن اور رَات؟''

''دونوں الگ الگ ہوتے ہیں۔ اِس طرح نہیں ہوتے۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔''

''نہ آئے۔''

''دِن کالا نہیں ہوسکتا؟''

''ہوتا رہے۔'' اُس نے اپنی جان چھڑائی۔

......❖......

بے موسمی گھٹا کو چھائے ہُوئے آج دسواں روز تھا۔

کیا کبھی ایسا بھی ہُوا ہے کہ تمام سمندر بہ یک وقت سائیکلون کی زد میں آئے ہوں؟ ساری زمین پر ایک ہی وقت میں سُورج طلوع ہُوا ہو؟ رات چھائی ہو؟ گھٹا چھائی ہو؟ یا جھکڑ آیا ہو؟ اندھیری چلی ہو؟ تاریکی طاری ہُوئی ہو؟ یا مینھ پڑنے لگا ہو؟

لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک ہی دِن میں گھٹا اُتری۔ پہلے روز ہَوا چلی جو اپنے ساتھ بادلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں لے آئی۔ رات خُوش گوار ہوگئی۔ لوگوں کے دِل خُوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ سماں عشق محبت کی پینگ پر جھولنے ایسا سہانا ہوگیا تھا۔ اُنھیں تو جیسے اُس رُت نے اپنے طرف کھینچ لیا۔ ایک دُوسرے کو دیکھ دیکھ کر دِل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں، زندگی اپنے جوبن پر دِکھائی دے رہی تھی اور ہر چہرہ مستی سے دمک رہا تھا۔ لیکن اگلے ہی روز آسمان کالی گھٹا سے بھر گیا۔ اِس قدر کالے بادل کہ دِن کی روشنی دھندلا گئی۔ لیکن بہت سے لوگ اب بھی بدمست پھرتے ہُوئے گھنگھور گھٹا کے جمال کو دیکھ

دیکھ کر نہال ہو رہے تھے۔

تو آج دسویں روز گھٹا اِتنا زور پکڑ گئی تھی کہ دِن رات لگنے لگا تھا۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے وقت کی چال بدل گئی ہو اور بادلوں نے سُورج کو نگل لیا ہو۔ بس دُھندلا دُھندلا اُجالا بتاتا تھا کہ اب دِن ہے اور جب وہ اُجالا ختم ہوتا تو سمجھ لیا جاتا کہ رات پڑ گئی ہے۔ آغاز کے تین چار دِنوں میں چلنے والی ہَوا نے بادلوں کو پہلے منتشر کیا اور پھر دوبارہ مجتمع کر کے پتا نہیں خُود کہاں چلی گئی۔ ہَوا کے غائب ہونے سے بے موسمی گھٹا میں بے موسمے پنکھے جھلے جانے لگے کہ شاید حبس کچھ اِس سے کم ہو جائے۔ رُت سے حظ اُٹھانے والے بھی اندر ہی اندر دہل رہے تھے۔

...... ❖ ......
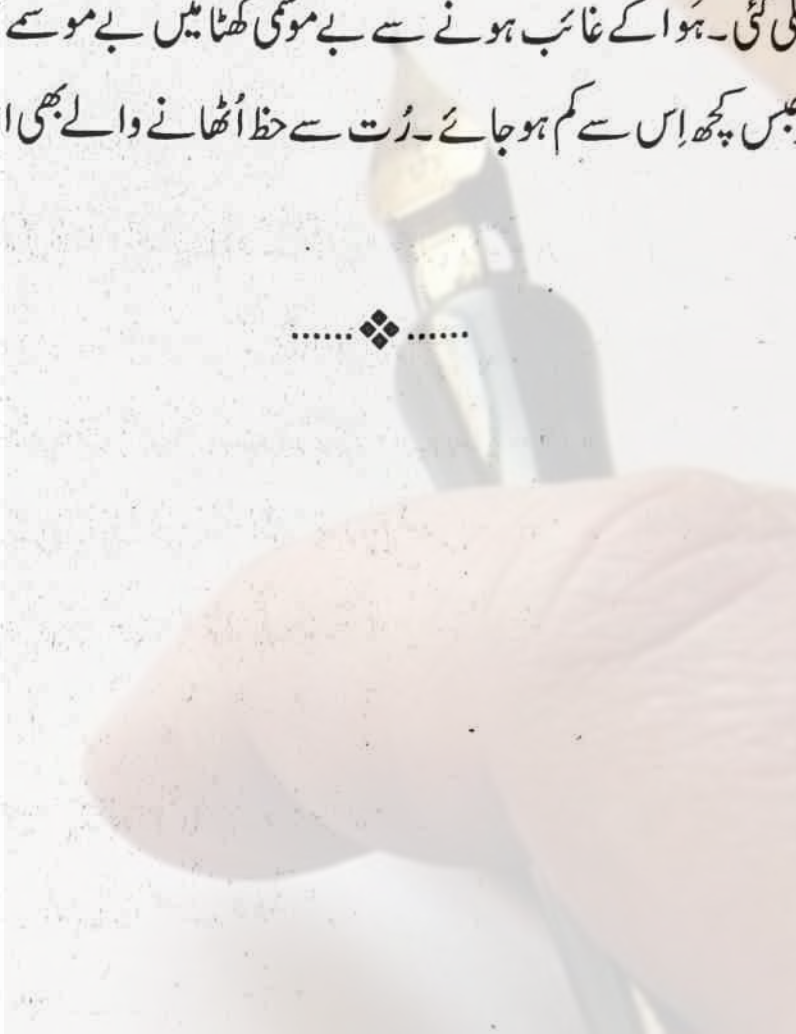
جمعرات کی گھٹا جہاں کی تہاں موجود تھی اور اب تو لوگ اندر سے اُس سے اِتنے خائف ہو گئے تھے کہ وہ اُسے دیکھ دیکھ کر کہہ رہے تھے۔

''یا تو یہ برس پڑے یا ٹل جائے۔''

دُنیا بھر کی تمام بستیوں، تمام شہروں کے ہر باسی کو یہی خوف کھائے جا رہا تھا کہ وہ گھٹا دُنیا کو غرق کر دے گی یا کوئی عذاب نازل ہو گا۔ لوگ اپنے اپنے طور پر اُس سے نجات کے لیے جتن کر رہے تھے۔

سب کو یہی توقع تھی کہ کسی کی دُعا یا مَنّت ہی اُن کے سروں پر سے اُس عذاب کا ٹال سکتی ہے۔

فطری امر ہے کہ جب آدمی بے بس ہو جاتا ہے تو قدرت کی طرف دیکھتا ہے، ربّ کو یاد کرتا ہے۔ پس جیسے ہی لوگوں کو اندازہ ہُوا کہ وہ کوئی عام گھٹا نہیں، کسی عذاب کا پیش خیمہ ہے تو اُنھیں حضرت نوحؑ کا قِصّہ یاد آنے لگا۔ کرۂ ارض کے طول و عرض کو اپنے گھیرے میں لیے وہ گھٹا اگر چھاجوں برس پڑی (گھڑے بوڑ) اور ساری زمین سمندر بن گئی تو اُن میں سے کون ہے جس نے اِتنا بڑا بیڑا تیار کر رکھا ہو۔ جس میں وہ دھرتی کے ہر جان دار کا

جوڑا سوار کر کے بارش تھمنے اور پانی اُترنے کے بعد نمودِ نو پاتی ہُوئی زندگی تک پہنچے۔ یہ سوچتے ہی — حق بات ہے — لوگ مشکل میں پڑے ہُوئے تھے۔ کسی طرف سے کوئی اچھی خبر نہیں مل رہی تھی اور نہ ہی ملنے کی اُمید تھی۔

ماہرینِ موسمیات بے بس ہو گئے تھے۔ حالاں کہ اُن کے پاس اپنے زمانے کے وہ تمام ساز و سامان تھے جن سے پتا لگایا جا سکتا تھا، لیکن پتا لگ نہیں رہا تھا۔ وہ بھی کیا کرتے؟ بس وہ اِتنا ہی بتا سکتے تھے کہ دُنیا کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ بادل زمین کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ اگر وہ تھوڑا سا اَور نیچے اُترے تو زمین پر چلتے پھرتے ہوں گے۔ بادلوں میں بجلی کا لشکارا اَور کڑک بہت زیادہ تھا۔ کڑک تو ساری دھرتی کے تمام باسی سن ہی رہے تھے۔ منفی چارج اور مثبت چارج والے بادل آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ منفی چارج والے بادلوں کا رُخ اب تک اُوپر کی جانب یا پھر زمین کے متوازی تھا۔ اور جب اُن کا رُخ زمین کے قریب والے مثبت چارج کے حامل بادلوں کی سمت ہُوا تو پھر قیامت کو برپا ہونے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ فضائی تحقیق کے سارے ادارے اپنی اپنی تگ و دَو میں شب و روز جتے ہُوئے تھے کہ جیسے تیسے بادلوں سے جان چھڑوائی جا سکے۔ دِن کا تو بس اب تصوّر ہی بچا تھا ورنہ ہر وقت بس رات ہی رات تھی۔ وہ فضا میں کوئی کم زور جگہ ڈھونڈ رہے تھے جہاں بادلوں کی پتلی پرت ہو، تاکہ بڑے بڑے پنکھوں کی ہَوا سے اُن میں رخنہ ڈال کر اُسے بڑا شگاف میں بدلتے ہُوئے بادلوں کو کائنات کے کسی ایسے مقام پر دھکیل دیا جائے جہاں سے واپس زمین کی طرف نہ پلٹ سکیں اور زمین بچ جائے۔ لیکن بادل آپس میں اِس طرح گتھے ہُوئے تھے کہ اُن کا ہر جتن ناکام ہوتا نظر آ رہا تھا اور وہ اب تک کچھ بھی نہیں کر پائے تھے۔

ایسی خبروں نے لوگوں میں ہراس، وسوسے، وہم اور خوف اِتنا زیادہ بڑھایا کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق دُعائیں مانگنے اور عبادتیں کرنے لگے۔ مسجدوں میں وقت

بے وقت اذانیں دی اور نمازیں پڑھی جانے لگیں۔ اتوار کے روز گرجے میں عیسائیوں کا اجتماع قابلِ دِید ہو گیا اور ہندوؤں کے مندر بھر گئے۔ کالی ماتا سے لے کر وشنو تک، اوسی رِس، نٹ، ایپو گیپ، زیوس، ایریس، قفنس، ایڈورا، ایلا، چیوتا، این کائی، اولورن تک سبھی دیوی دیوتاؤں سے منّتیں اور توبہ طلب ہونے لگیں اور چڑھاوے چڑھائے جانے لگے۔ ڈھیر سارے یہودی اور بُدھ بھکشو اپنے اپنے عبادت خانوں میں پہنچ کر عبادتوں میں جت گئے۔ با جماعت عبادتیں، دُعائیں اور گناہوں سے توبہ تائب کے ساتھ ساتھ ٹونے ٹوٹکے بھی کیے گئے لیکن گھٹا نے برسنا تھا نہ برسی۔

......❖......
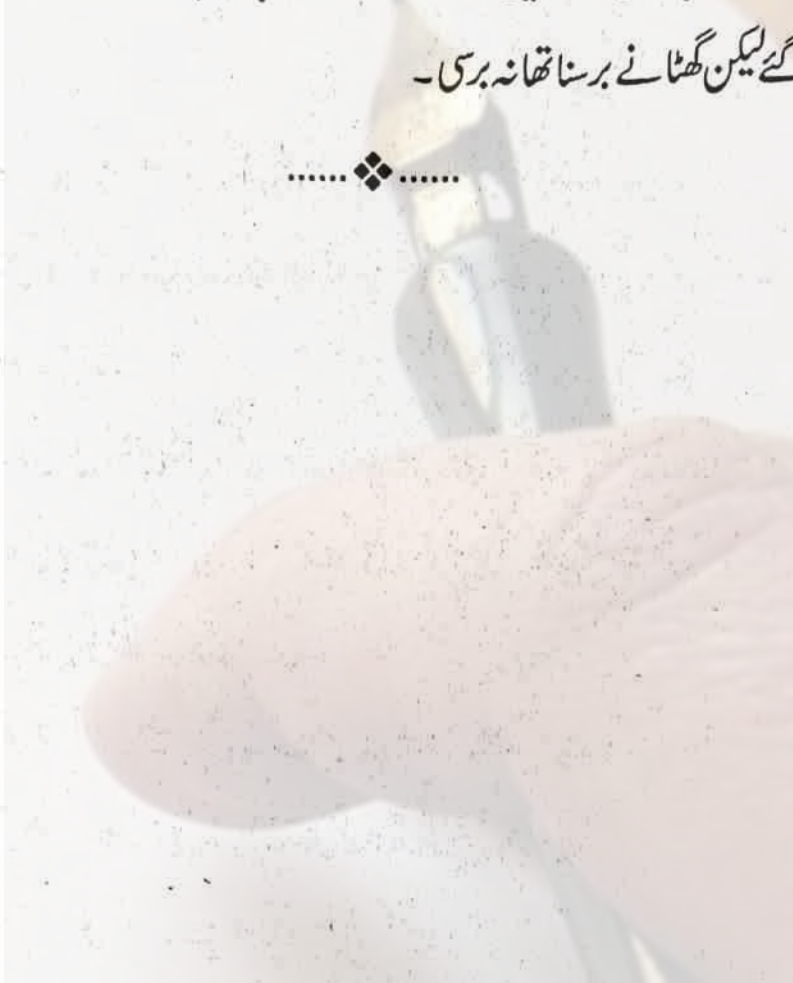
''ہر کوئی اپنے حِصّے کی جنگ لڑتا ہے۔'' یہ لکھ کر اُس نے قلم میز پر دھر دیا۔

''میں تو تمھارے حصّے کی جنگ لڑ رہی ہوں۔'' کاغذ پر سے لفظوں کی روشائی نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

روشنائی کی دِھیمی آواز کی طرف اُس کی توجہ نہ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ''دُنیا میں جنگیں کیوں ہوتی رہیں، ہو رہیں اور اب بھی؟ کیا ہم اُنھیں روک نہیں سکتے؟'' اُس کی سوچیں اُس کی باتوں کی طرف چلی گئیں۔

''تم جو جنگ اپنے آپ سے لڑ رہے ہو پہلے اُسے روکو! تمھارے درمیان ہر وقت جنگ چلتی رہتی ہے۔ اِس بارے میں تم نے کبھی نہیں سوچا۔''

''وہ دُوسری جنگ ہے، وجود والی۔''

''جنگ ہمیشہ بس جنگ ہوتی ہے کچھ اَور نہیں۔ یہ جنگ جب باہر کا رُخ کرتی ہے تو بڑی جنگ بن جاتی ہے۔ پہلے اِسے ختم کرو۔ اگر یہ ختم ہو گئی تو سب جنگیں ختم ہو جائیں گی۔''

''میں نے اُس جنگ کی بات کی ہے جس میں بربادی ہوتی ہے۔''

''میں اپنے وجود سے جنگ کر رہا ہوں؟''

''میں نے تو کبھی اپنے وجود سے جنگ نہیں کی۔''

''وجود تو جنگ کرتا رہتا ہے۔ یہ جنگ جاری رہے گی۔''

''پھر وہ بھی جاری رہے گی۔''

''وہ جنگ ہم نہیں جیت سکتے۔''

''کون سی جنگ؟'' اُس نے سوال کیا۔

''کوئی جنگ نہیں۔''

''پھر یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ میں تو چپ چاپ بیٹھا سوچ رہا ہوں۔ تم نے ہی تو لکھا ہے کہ ہر کوئی اپنے حصّے کی جنگ لڑتا ہے۔''

''ہاں، لکھا ہے لیکن اُس کے بعد تو میں نے کچھ نہیں لکھا۔''

آخر تنگ آ کر اُس نے قلم اپنی مُٹھی میں دبا لیا۔

......❖......

چبائے ہُوئے کاغذ اُس کے نزدیک پڑے تھے اور اُسے غصّہ چڑھ گیا۔ کاغذ تُھوک اور لَیس سے بھرے ہُوئے تھے۔ اُس کا طیش بڑھتا چلا گیا۔

''اُس مردود کو آخر اتنا زیادہ چبا کر پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟ ویسے ہی پھینک دیتا جیسے روز پھینکتا ہے۔'' اُسے کمرے میں سے اُبکائیوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ چبائے ہُوئے کاغذ ایک ایک کر کے باہر پھینکتی گئی۔

''لَیس سے بھر ڈالا۔ مردود، مرتا بھی نہیں۔''

اُسے لگا جیسے یہ اُبکائی اندر سے نہیں اُس میں سے آ رہی ہیں۔ اُس کے قریب چبائے ہُوئے کاغذوں کی ایک ڈھیری بن گئی تھی۔ اُس نے اُنھیں جگہ جگہ پھینکا تھا۔ ایک جگہ ڈھیری کیسے بن گئی؟

اُسے ڈھیری سے خوف آنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔ اُسے یہ بھی خوف تھا کہ اُس کے کھسکنے کی آواز اُس تک نہ پہنچ جائے اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُسے دیکھ نہ لے۔

کھسکنے کی آواز دِھیمی پڑتی گئی۔ وہ اپنے آپ کو اَور آگے کھسکنے کی صلاح دیتے ہُوئے آگے بڑھی۔

اُبکائی ایک لکیر کے مانند — ایک بے حد پتلی اور نا دِکھائی دینے والی لکیر — اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جس کے ایک طرف وہ پڑی تھی اور دُوسری جانب ڈھیری۔ اُسے ڈھیری اپنے اُوپر گرتی ہُوئی دِکھائی دی تو وہ اپنی جگہ پر سمٹتی چلی گئی۔

……❖……
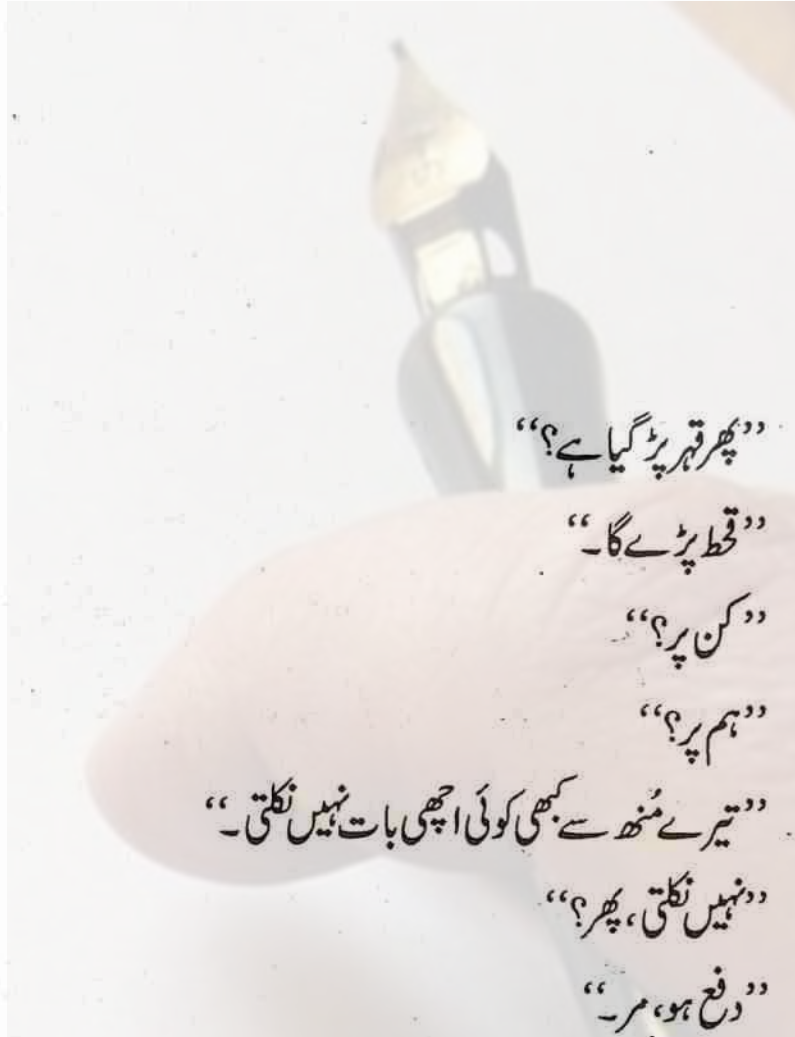
”پھر قہر پڑ گیا ہے؟“

”قحط پڑے گا۔“

”کن پر؟“

”ہم پر؟“

”تیرے مُنھ سے کبھی کوئی اچھی بات نہیں نکلتی۔“

”نہیں نکلتی، پھر؟“

”دفع ہو، مر۔“

”تُو مر۔“

”تم میں ذرا بھی حیا نہیں۔ تم صبح سے یہی بک بک کر رہے ہو۔“

”میں بک رہا ہوں؟“

”اور کون کہہ رہا ہے؟“

''یہ بات تو ہر طرف پھیلی ہُوئی ہے کہ قحط پڑے گا۔''

''تم پر نازل ہوگا۔''

''کیوں؟ تم انوکھے ہو؟''

''ہاں، ہم قحط کے جم پل ہیں۔''

''لڑائی تو ہوگی۔'' اُس نے خُود کلامی کی۔

……❖……

طلوعِ فجر سے ذرا پہلے، ابھی لوگ نیند میں تھے کہ فضا میں اَنہونی کے اُتر آنے والے خوف نے اُنھیں تڑپا کر جگا دیا۔ لوگوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ہُوا ہے؟ لیکن جب وہ اُٹھے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا بَل کہ مطلع صاف تھا البتّہ کوئی وحشت اور دہشت ضرور تھی۔ پُوری بستی کے جوان، بُوڑھے، عورتیں، بچّے اپنے گھروں میں سے باہر نکل آئے اور سہمے ہُوئے ایک دُوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ کیا ہُوا ہے؟ لیکن کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ سب حیران پریشان تھے۔ سب کے چہروں پر تحیّر زا خوف صاف دِکھائی دے رہا تھا۔

ابھی وہ اپنے سانس درست کر ہی رہے تھے کہ گھوڑوں کی دڑ دڑ اُن کے کانوں میں پڑی۔ یہ کیا ہے؟ گھوڑے کہاں سے آ رہے ہیں؟

سب ایک دُوسرے کو پریشان نظروں سے دیکھنے لگے۔ اِتنی ہی دیر میں بے شمار گھڑ سوار بستی والوں کے سر پر پہنچ گئے کیوں کہ وہ تمام ایک ہی جگہ پر اکٹھے اور خالی ہاتھ تھے۔ آنے والوں کے سروں پر آہنی خود اور ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ کمروں سے تیر کمان

لٹکے ہُوئے اور بغلوں میں نیزے، بھالے بندھے ہُوئے تھے۔ کئی سواروں کے پاس تو ایسے ہتھیار بھی تھے جو بستی والے پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی سواروں کے سربراہ نے کسی اَنجانی اور کھردری زبان میں اپنے ساتھیوں کو پُکار کر کچھ کہا۔ اُس نے اَنجانی زبان میں کیا کہا تھا، بستی والوں کو سمجھ نہیں آئی اور نہ ہی اُنھوں نے پہلے کبھی وہ زبان سنی تھی۔ بستی والوں میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کی لیکن جال میں آئے پنچھیوں کے مانند پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

اُنھوں نے بھاگتے ہُوؤں کو تلواروں سے کاٹ ڈالا۔ اُن کے سر ایک طرف تو دھڑ دُوسری طرف پڑے تھے اور پھڑکتے ہُوئے جسموں سے خُون بہہ بہہ کر دھرتی کا رنگ بدل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ لوگوں نے بچتے بچاتے پنج ہزاری کی جانب دوڑ لگائی اور اپنے آپ کو اُس کے تنے کے عقب میں چھپانے کی کوشش کی لیکن پنج ہزاری کے پتّے ہل ہل کر یُوں شور مچانے لگے جیسے ہزاروں ہاتھ تالیاں پیٹ رہے ہوں۔ اُنھیں یُوں لگا جیسے جارِح تو جو ماریں گے سو ماریں گے اگر وہ تھوڑی سی دیر بھی پنج ہزاری کے نیچے کھڑے رہے تو پتّوں کے شور سے ہی مر جائیں گے۔ لگتا تھا گویا پنج ہزاری حملہ آوروں کو اُن کی وہاں موجودگی کے بارے میں آگاہ کر رہا ہے۔ اُس نے پچھلی جارحیت کے دوران میں ایسا نہیں کیا تھا۔ بَل کہ اُن کے بزرگوں کو اپنے پتّوں میں چھپا کر پناہ دی تھی۔ کیا اِس مرتبہ وہ جارِحوں کے ساتھ مل گیا تھا۔

بس پھر کیا تھا۔ وہ دُوسری طرف بھی بھاگے تو بھاگتے بھاگتے اُن کی گردنوں پر تلواریں پڑیں اور وہ وہیں گر پڑے۔

بستی بھر کے مردوں، عورتوں، بچّوں کو حملہ آوروں نے اپنا غلام بنا لیا۔ اُنھوں نے اپنے کچھ آدمی وہیں چھوڑے اور باقی کچھ عورتوں کو گھسیٹتے ہُوئے اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ

دُوسرا دھاوا تھا اور اِس جارحیت نے بستی کے باسیوں میں جینے کی تمنا ہی ختم کر ڈالی تھی۔

حملہ آوروں کے ساتھیوں نے وہاں اپنا ڈیرا جما لیا اور بستی والے اُن کے غلام اور عورتیں اُن کی کنیزیں بن کے زندگی کے دِن پُورے کرنے لگیں۔ بستی والے دِن بھر جارِحوں کے کاموں میں جتے رہتے اور رَات کو اُن کی عورتیں حاکموں کی خدمت گذاریاں کرتیں۔
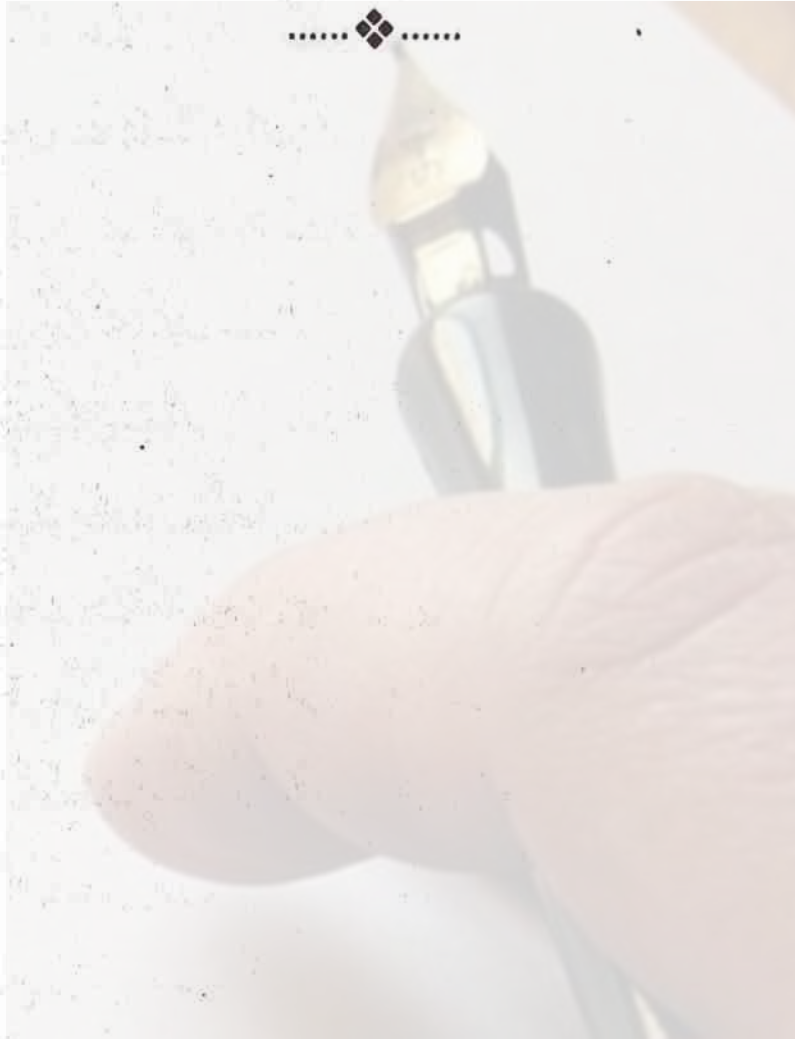
زمین پر پچھلی بار کی خُون کی ہَولی کے نشان اب تک موجود تھے۔ بچے کھچے لوگوں، جو غلاموں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے تھے، اور دُوسرے لوگوں کا خُون ایک دفعہ پھر بہا۔

بدیسی حاکم کی بادشاہی میں خوف و دہشت بھری زندگی گذارتے ہُوئے لوگوں نے جب ایک صبح اپنی آخری پناہ گاہ کے دَرو دِیوار کو خُون کا غسل دیا تو صحن کو لہو کا ایک تالاب بنا ہُوا پایا۔ رات کے آخری پہر میں اُن کی آخری آس کو بھی قتل گاہ بنا کر ویران کر دیا گیا تھا۔ وہاں موجود مجاوروں اور سوالیوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ اُن کی گردنیں تیز دھار تلواروں سے ایک ہی وار میں تن سے جُدا کر دی گئی تھیں۔ سینوں میں بھالے اُتار دیے گئے اور پھر مُردوں کو چھت کے شہتیروں سے لٹکا کر نشانِ عبرت بنا دیا گیا تھا۔ شاید یہ دھاوا اِس قدر سرعت سے بولا گیا تھا کہ کسی کو اپنی جگہ سے ہلنے تک کا موقع نہیں ملا اور نہ ہی کسی کی ذرا

سی بھی آواز نکلنے دی گئی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ بستی کی ایک سمت میں واقع دربار کے قریب بسنے والوں کو صبح کے وقت جاگنے پر ہی پتا چلا؟

دربار پر سپاہ کا پہرا تھا اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن بیرونی ویرانی گہرا سکوت اور سُرخ دھرتی دُور ہی سے دِکھائی دینے والے مزار کی بربادی سارا حال خُود کہہ رہی تھی۔ یہ سب کس نے کیا اور کس کے کہنے پر؟

کسی کو معلوم نہیں تھا۔

بھید حکم نامے نے کھولا۔

کوتوال نے صدر دروازے پر چرمی چادر پر لکھا ہُوا ابدیسی حاکم کا حکم ٹانگا۔ ''آج سے دربار بند۔ یہاں دُعا یا مَنّت مانگنے کے لیے آنے والے کا بھی یہی حشر ہوگا۔''

دربار پر سپاہ کا پہرا لگ گیا اور کبھی کبھار کوتوال بھی پھیرا لگانے لگا۔ کوتوال نے مزار کے سامنے والے بڑے میدان میں سارے مقامی لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ جونہیں آئے اُنھیں کُتوں کے مانند ہنکا کر لایا گیا۔ کوتوال نے اُنھیں خبردار کیا کہ حاکم کو اُس کے جاسوسوں نے تمھارے کرتوتوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ تم نے دربار میں سازشوں کا دربار لگا رکھا ہے۔ اب اگر کسی نے مزار کی طرف مُنہ بھی کیا تو ہمیں حکم ہے کہ بلا تفتیش اُس کی گردن اُڑا دی جائے۔ سمجھ گئے؟

''اب اگر یہاں رہنا چاہتے ہو تو انسان بن کر رہو جس طرح ہم چاہتے ہیں اُس طرح، ورنہ یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔'' اُس نے پنج ہزاری کے عقبی جنگل کی طرف دو اُنگلیاں اُٹھا کر کہا۔ لوگوں کی جنگل کی سمت مُڑی ہُوئی گردنیں اُس کے دوبارہ بولنے پر سیدھی ہُوئیں۔

''اب یہ ہمارا ملک ہے۔ ہماری دھرتی ہے۔ یہاں صرف ہمارا حکم چلے گا اور تم ہماری رعایا ہو۔''

جھکی ہُوئی گردن اور آنکھوں میں فکرمندی اور دہشت تیر رہی تھی۔

''اُنگلی کا اشارہ اب پنج ہزاری کی جانب تھا۔ کیا اب پنج ہزاری کی باری ہے؟''

مُردہ قدموں سے واپس آتے ہُوئے لوگ سوچ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں دہشت زدگی نظر آرہی تھی اور وہ اِس طرح ''صم بکم'' دِکھائی دے رہے تھے جیسے اُن کی زبانوں پر دہکتے ہُوئے کوئلے رکھ دیے گئے ہوں۔ ایک دُوسرے سے بات کرنے ہی سے نہیں بَل کہ ایک دُوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی خائف تھے۔

''اب کیا ہوگا؟ کیا بنے گا؟'' ہر جھکی ہُوئی نظر زمین سے یہی سوال کر رہی تھی۔

پھر اُنھیں سسکیاں سنائی دیں جیسے کوئی اُن کے دُکھ پر آہیں بھر رہا ہو۔ سسکنے کی آواز ہر سُو سے آرہی تھی اور اُنھیں کوئی پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون سسک رہا ہے۔

......❖......

وہ بیٹھا لکھ رہا تھا۔

''ہم نے آج تک کسی کی مِلک پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی پھر بھی لوگ باہر سے آکر ہماری دھرتی پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

''ہم اِتنے کم زور نہیں جتنا لوگ ہمیں سمجھتے ہیں۔ اگر ہم اُن کی دھرتی پر قبضے کی کوشش کرتے تو وہ ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔''

''تو تم نے اُنھیں اپنی دھرتی پر قبضہ کیوں کرنے دیا؟''

''ہم نے نہیں کرنے دیا۔ ہمارے پُرکھوں نے اُنھیں یہ دھرتی دی ہے۔''

''طاقت ور تھے اِسی لیے قبضہ کر کے بیٹھے ہیں۔''

اِس بات کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سدا یہی سوچتا تھا کہ آخر وہ کسی اَور جگہ سے آ کر اِسے اپنے جائے مسکن کیوں بنائے بیٹھے ہیں؟ نہ ہماری زبان ایک نہ رسوم ورواج ایک جیسے۔ پھر جگہ ہماری اور ملکیت اُن کی اور غلام بھی ہم؟

''تم غلام ہی رہو گے، تمھاری سوچ کی حد ہی اتنی ہے۔ اِس سے آگے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''ہم غلام ہوں گے لیکن کبھی کسی جارحیت پر بھی ہم نے اپنی دھرتی نہیں چھوڑی۔ ویسے بھی ہم اپنا وطن کیوں چھوڑیں؟''

''ماں اور دھرتی بھی کوئی چھوڑتا ہے!''

''ہاں، اگر حالات ایسے ہو جائیں تو کبھی چھوڑنا بھی پڑ جاتا ہے۔''

''وطن چھوڑنے سے اگر جان بچتی ہو تو اُسے چھوڑ دینا چاہیے۔''

''دھرتی تو پھر بھی مل جاتی ہے۔ جان نہیں ملتی۔''

''جان وطن سے اہم نہیں ہوتی۔ اگر جان دے کر اپنی دھرتی بچتی ہو اِس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔''

......❖......

پتا نہیں، مردود آج کیا لکھ رہا ہے۔ آج پھر میرا دوزخ بھرے گا۔ یہ سوچ کر اُس نے آنے والے کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ آج اُس کے ہاتھ میں گولے کے بجائے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ اُس نے وہیں کھڑے ہو کر اُن پرچیوں کو ایک دوبارہ پڑھا اور پھر اُن میں سے ایک پرچی اپنے دُوسرے ہاتھ میں تھامتے ہُوئے باقی توڑ مروڑ کر پھینک دیں۔

میری یہ کہانی آج کی نہیں صدیوں سے چلتی آ رہی ہے۔ یہ کھوج کی ایک طویل داستان ہے۔ ابھی اُس نے اِتنا ہی لکھا تھا کہ اُس کا ہاتھ بَل کھانے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اُس کے ہاتھ کو مروڑ رہا ہو۔ ہاتھ میں ہونے والے درد نے اُسے بے بس کر دیا اور قلم اپنے آپ اُس کے ہاتھ سے نکل کر کاغذ کے اُوپر، گر گیا۔

''شاید پٹھا چڑھ گیا ہے! لیکن کچھ دیر پہلے تک تو بالکل ٹھیک تھا! شاید میری رَگیں چڑھ گئی ہوں!''

اُس نے اپنا ہاتھ کو دیکھا جہاں تکلیف کے سِوا کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنا ہاتھ دبانے لگتا ہے لیکن درد کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی نظر قلم پر پڑتی ہے، نِب سے روشنائی دِھیرے دِھیرے بہہ رہی ہے اور اُس کا لکھا ہُوا مٹ رہا ہے۔

......❖......

پنج ہزاری کے بارے میں پختہ روایت چلی آ رہی تھی کہ پہلی جارحیت کے وقت اُس بستی وَالے اُس کے پتّوں میں چھپے رہے تھے۔ اُس زمانے میں اُس بستی کی آبادی بہت کم تھی اور باقی ساری بستی بیلا ہوتا تھا اور کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ جب دھاوا بولا گیا تھا تو چند لوگوں نے اُس پیڑ کے پتّوں میں اپنے آپ کو پوشیدہ کر کے اپنی جان بچائی تھی۔ اگرچہ اُس وقت وہ ایک جوان درخت تھا لیکن اُس کے پتّے بے حد گھنے، شاخیں ایک دُوسرے سے جُڑی ہُوئیں اور اُس کی داڑھی کے روئیں ابھی پُھوٹ رہے تھے۔ لوگ اِس روایت میں اضافہ کرتے ہُوئے یہ بھی بتاتے تھے کہ جب اُس بستی کے باسی پنج ہزاری کے پتّوں میں چھپے تو اُس نے اپنے پتّے سمیٹ کر اُنھیں اِس طرح بچایا جیسے چیل کو دیکھ کر مُرغی چوزوں کو اپنے پَروں تلے چھپا لیتی ہے۔

لوگ یہ بھی سناتے تھے کہ اِس بار جب جارِح چہار سُو پھیلے ہُوئے جنگل میں چڑھائی کرنے کی غرض سے گھسے تو پنج ہزاری نے اپنے بڑے بڑے پتّوں کو زور زور سے ہلاتے ہُوئے کھڑکھڑا کر شور و غل مچایا، لیکن لوگ اُس کی تنبیہ سمجھ نہیں سکے۔

اِسی بناء پر وہ اُس پیڑ کے ممنون تھے جس نے مصیبت کے وقت اُن کے بڑوں کی

جان بچائی تھی۔ ہر کوئی اپنی سنی سنائی میں دو چار باتوں کا اضافہ کر کے قِصّہ سناتا تھا۔ سچ کیا تھا اور جُھوٹ کیا، اِس کی حقیقت پنج ہزاری کو معلوم تھی اور وہ ایک مدت سے چُپ سادھے یہ سب قِصّے سن رہا تھا۔

لوگوں میں تو اُس جنگل کے بارے میں بھی طرح طرح کی روایتیں چلی آ رہی تھیں، جو اب وہاں باقی نہیں رہا تھا اور زمانے کے نشیب و فراز، بستیوں کے پھیلاؤ، ایندھن کے لیے لکڑیوں، نئی آبادیوں اور نئے مکانوں کی ضرورت کی نذر ہو کر آہستہ آہستہ ختم ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس جنگل میں وہ درخت بھی تھے جن پر اپنے خالق سے بغاوت کا الزام تھا اور اُنھوں نے ہمیشہ طاقت وَر اور ظالموں کو ہی پناہ دی تھی۔ یہ روایت بھی چلی آ رہی تھی کہ قیامت تک وہ درخت اِسی کام میں جتے رہیں گے اور لوگ اُنھیں ''دوزخی'' پیڑ کہتے تھے۔ اُس جنگل میں دُوسرے درخت بھی تھے لیکن بہت کم۔ اُس خاص درخت کے بڑی تعداد میں جھنڈ موجود تھے اور جب بھی جارِح اُس جنگل میں آئے تو وہ پیڑ اِتنے مسرور ہُوئے کہ پُھولے نہیں سماتے تھے اور اُنھوں نے جارِحین کو اپنی آغوش میں یُوں چھپایا کہ آدھی رات کو خُون کی ہَولی کھیلنے تک کسی کو بھنک تک نہ پڑی کہ بستی پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے۔

چرواہوں اور لکڑہاروں کو وہاں گردش کرتے رہنے کے باوجود بھی سرسراہٹ تک نہ سنائی دی کہ وہاں کوئی عذاب چھپا بیٹھا ہے۔

کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ کبھی کبھی پنج ہزاری کے پتّوں سے، چاہے مینھ یا شبنم نہ ہو تو بھی، بُوندیں گرتی ہیں جو کوئی عام بُوندیں نہیں بَل کہ پنج ہزاری کے آنسو ہیں۔

لوگوں کا گمان تھا کہ جب بھی بستی والوں پر کوئی آفت یا مصیبت نازل ہونے والی ہو تو پنج ہزاری اُن کے دُکھ میں آنسو بہاتا ہے۔ بستی کے جتنے افراد تھے پنج ہزاری کے بارے میں قِصّے بھی اُتنے ہی تھے لیکن لوگوں کا آپس میں یہ تنازعہ بھی چلتا رہتا تھا کہ ایک

درخت کیسے آنسو بہا سکتا ہے۔ ماننے والے مانتے تھے اور نہ ماننے والے اپنی بات کو حرفِ آخر سمجھتے تھے۔

یہ باتیں نہ صرف اُس بستی میں چلتی رہتی تھیں بل کہ قرب و جوار کی چھوٹی بڑی آبادیوں میں بھی لوگ اِس موضوع پر گفتگو کر کے اُس پیڑ کے بارے میں اپنے قیاس لگاتے رہتے تھے۔
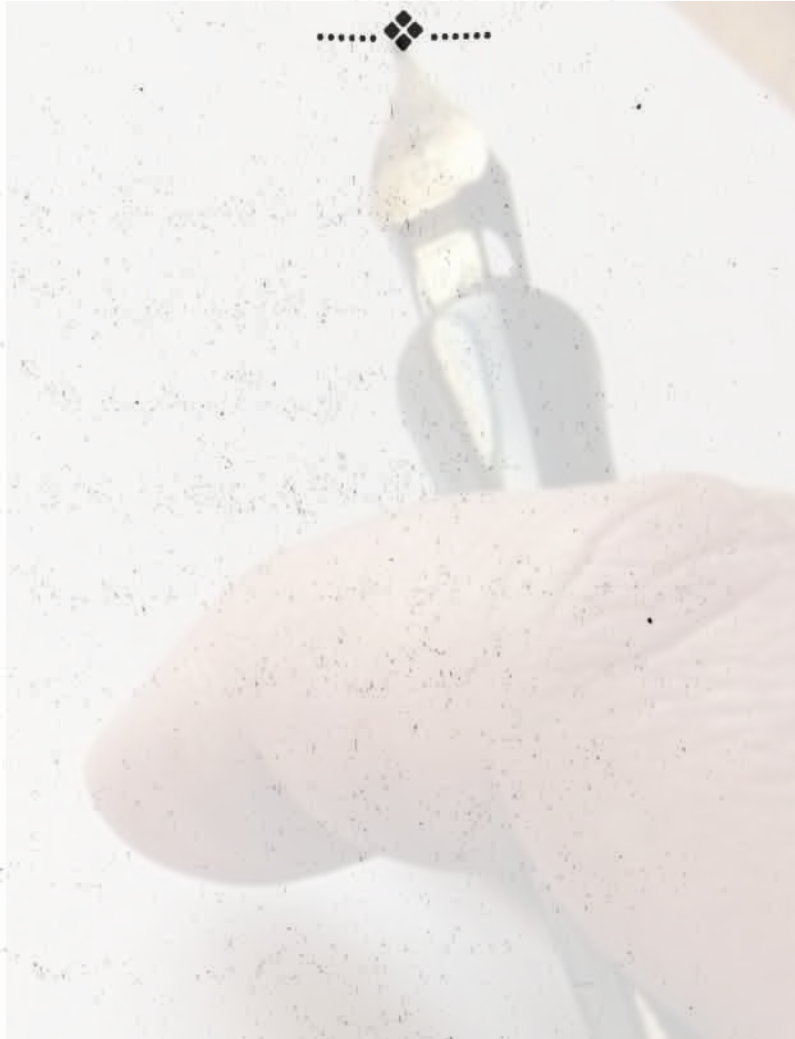
”تیرا دماغ اُلٹی بات ہی سوچتا ہے۔“

”نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”تمھیں اب تک پتا نہیں چلا؟“

”مجھے تمھاری بات کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی۔“

”ہم سے پہلے بھی تو لوگ تھے جو اَب قبروں میں پڑے ہیں۔“

”اِس بات کا اِس سے کوئی تعلّق بنتا ہے؟“

”بنتا ہے۔“

”کیسے؟“

”لکھنا پڑھنا کب شروع ہُوا ہوگا؟“

”جب سے انسان نے بولنا سیکھا ہوگا......!“

”نہیں، یہ بولنے کے بعد کی بات ہے۔“

”چلو، مان لیا۔“

”وہ کیا لکھتے تھے؟“

''اپنے زمانے کی باتیں، اور کیا؟''

''وہ جنتی ٹھیرے۔''

''تمھیں کیسے پتا؟''

''ہم جو جہنمی ہیں۔''

''کیسے؟''

''اِس کے بارے میں تمھیں پتا ہونا چاہیے۔''

''مجھے؟''

''ہاں، تمھیں۔''

......❖......
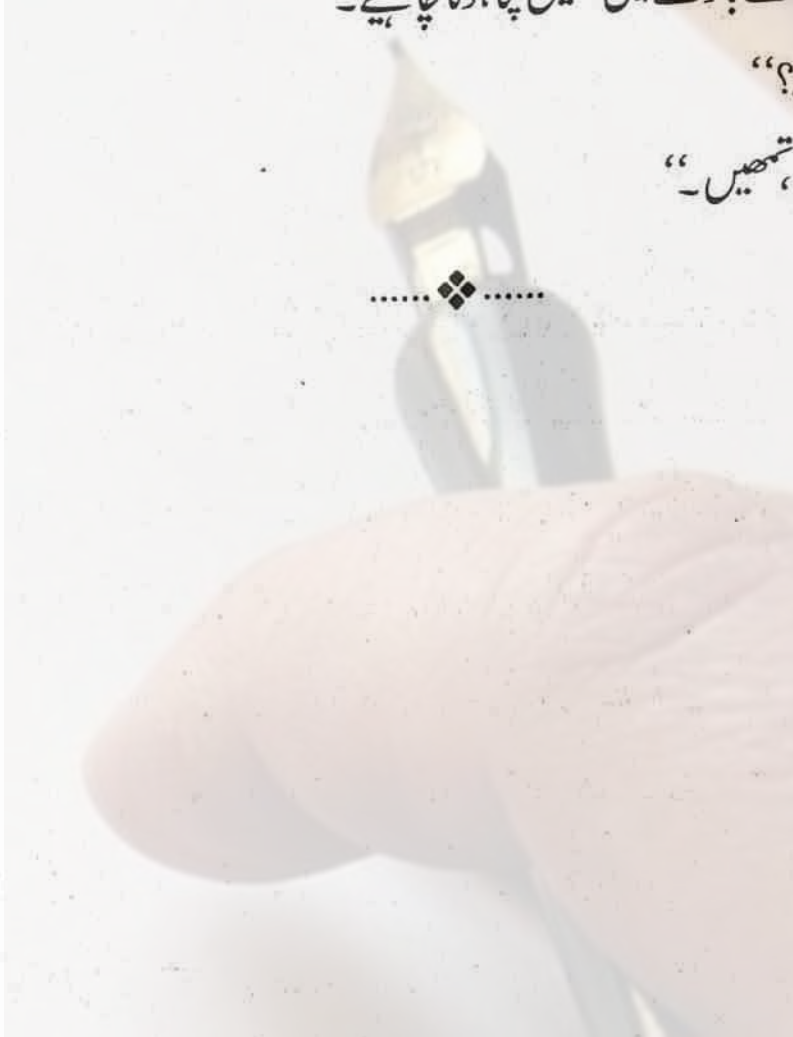
دِن رات کا فرق مٹتے ہی لوگوں کو تاریکی میں چھوٹے بڑے سائے دِکھائی دینے لگ گئے۔ آدمی تنہا کہیں جاتے ہُوتے ڈرتا تھا کہ اُسے پیچھے سے کوئی سایہ ہی نہ چمٹ جائے۔ اِس خوف سے لوگوں نے گھروں سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ کبھی نکلنا بھی پڑتا تو چار چار چھے چھے اکٹھے نکلتے لیکن پھر بھی دہشت سے اُن کی جان نکلتی تھی۔

ہر وقت اُنھیں یہی نظر آتا کہ پنج ہزاری آسمان سے یُوں جُڑا ہُوا ہے جیسے وہ زمین کے بجائے آسمان کا حِصّہ ہو۔ دُور سے اُنھیں پنج ہزاری کے پتّوں میں سے پرچھائیاں جھانکتے اور نیچے اُترتی ہُوئی دِکھائی دیتیں۔ لگتا تھا جیسے پنج ہزاری کا ایک وجود نہیں رہا، بستی میں جگہ جگہ اُس کے وجود بکھر گئے ہیں۔ کہیں اُس کی کوئی شاخ چلتی پھرتی تو کہیں اُس کے پتّوں میں سے نئی نئی شکلیں نکل نکل کر بادلوں کا ہی ایک حِصّہ بنتی دِکھائی دیتیں اور بہت سے لوگوں کو گھٹا میں سے بلائیں اُتر کر زمین پر چلتی پھرتی نظر آتیں۔

ابھی سایوں کا ڈر ختم نہیں ہُوا تھا کہ بستی والوں کی سماعت سے آٹھوں پہر بین کرتی ہُوئی اور ڈراؤنی آوازیں ٹکرانے لگیں۔

دہشت ناک کالی بلائیں، جن کی نظریں وہاں کے باسیوں کے وجود کے آر پار ہو کر زمین کے اندر جا گھستیں۔ اِسی لیے بستی کے سیانے کہہ رہے تھے کہ آسمان سے بلائیں اُتر آئی ہیں جو گھٹا کو برسنے نہیں دے رہیں۔ کچھ سیانے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ کسی بدکار نے پنج ہزاری کی کونپلوں پر جادو کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے نیا عذاب نازل ہُوا ہے۔ حواس باختہ لوگ مصیبت میں پڑے ہُوئے تھے۔

وہ لکھتا رہا:

کڑکتی بجلی میں چیونٹی کی چُپ دِکھائی دے رہی ہے۔

میں چُپ کو پُکارنا چاہتا ہوں لیکن میری آواز بند ہو گئی ہے۔ میں نے زور لگا کر بولنا چاہا۔ بادل کی گرج سیدھی میری آواز میں گھس کر میری زبان پر گرجنے لگتی ہے۔

''یہ چُپ کی گرج ہے۔'' کوئی مجھے بتاتا ہے۔

میری زبان انگارہ بن کر دہکنے لگتی ہے۔ میں زبان کو تالو کے ساتھ لگا کر محسوس کرتا ہوں۔ تالو اور زبان ایک دُوسرے کے ساتھ پُچ بٹن کے مانند آپس میں جُڑ جاتے ہیں۔

میری آنکھوں کے سامنے چُپ کی گرج محوِ رقص ہو جاتی ہے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں۔ بجلی کڑک اور بادل گرج رہے ہیں۔ میری نگاہیں اب بھی آسمان کی طرف ہیں۔

گھٹا چیونٹی کی رفتار سے چل رہی ہے...... چل رہی ہے...... چل رہی ہے......

''یہ پتا نہیں کہ گھٹا اِس رفتار سے چل رہی ہے یا چیونٹی یا پھر دونوں یکساں رفتار سے چل رہی ہیں......''

......❖......

میں بھی تو دیکھوں، یہ کیا لکھ رہا ہے؟ اُس نے اپنے اندر پڑے کاغذ کو پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ ہر سطر سے چھوٹے چھوٹے سانپ نکل کر اُس کا مُنھ چڑانے لگے۔ ''یہ سنپولیے کہاں سے آ گئے؟'' اُسے لگا جیسے اُس کا شِکم سانپوں کی بانبی ہے جس میں سے نکلنے والے پتلے پتلے سانپ اُس کے چوطرف پھرتے ہُوئے اپنی زبانیں لہرا رہے تھے۔

چوتھے کونے میں بیٹھی مکڑی یہ سب دیکھ رہی تھی کہ ایک گولا نکل کر اُس کے اُوپر گِرا۔ مکڑی گولے کے بوجھ تلے سے نکلنا چاہتی تھی لیکن نکل نہیں پائی۔ '' لکھے ہُوئے کا بوجھ ہے یا گولے کا؟''

اُسے یُوں لگا گویا چوتھا کونا پہلے کونے کو دیکھ کر مُسکرا رہا ہے۔ پہلے کونے کا گولا چوتھے کونے کی دِیوار تک کیسے پہنچا؟

اُس کے پیٹ پر بیٹھے سانپ چوتھے کونے کو چاٹنے لگے تھے۔ گولا دِیوار کے اندر بیٹھا ہُوا ہے اور مکڑی کی ایک آنکھ پہلے کونے پر جمی ہے اور اُس کے پیر چوتھے کونے میں سمٹے ہُوئے ہیں۔

''یہ سانپوں کی کوئی کہانی تو نہیں لکھ رہا ہے؟'' اُسے اِس کے بعد کوئی خیال نہیں سُوجھتا۔

سانپ اُس کے شکم میں سے نکل کر اُس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہُوئے ہیں۔

''میں نے پڑھنے کی کوشش کیوں کی؟''

''یہ سانپ اِس کاغذ میں لکھے ہُوئے الفاظ میں سے نہیں نکلے؟''

''یہ بعد میں سانپ بنے ہیں......میں نہ ہی پڑھتی!''

......❖......

آج صبح سویرے پنچ ہزاری بہت مسرور دِکھائی دے رہا تھا۔ کیوں کہ آج بہت عرصے کے بعد اُس کی شاخوں پر گُرشلیں، فاختائیں، طوطے اور چڑیاں اپنی بولیوں میں حال احوال کہہ سن رہے تھے اور اب تک کوئی انسان اُس کے قریب سے نہیں گذرا تھا۔ یا شاید اِس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ابھی تک کوّے کائیں کائیں کرتے ہُوئے وہاں نہیں آئے تھے یا پھر وہ گِدھ، جس کے ہوتے ہُوئے پنچ ہزاری اپنی شاخیں زور زور سے ہلانے لگتا تھا، ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی کہ چڑیوں کی چیں چیں اور طوطوں کی ٹیں ٹیں تو اُسے اچھی لگتی اور فاختہ کی آمد سے وہ بے حد خُوش ہوتا تھا۔ بس کوّوں اور گِدھوں سے اُسے چڑ تھی۔ جُوں ہی وہ دونوں اُس کی شاخ پر بیٹھتے اُس کا سارا وجود تھر تھر کانپنے لگتا تھا۔

کوّوں اور گِدھوں کو بھی اِس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ پنچ ہزاری اُنھیں ناپسند کرتا ہے، پھر بھی وہ اُسے چڑانے کے لیے کبھی کبھار تھوڑی دیر کے لیے ضرور پھیرا لگاتے تھے۔ فاختہ کی گُھو گُھو تو گویا پنچ ہزاری کے تن من میں اُتر جاتی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ سب

کچھ بُھول بھال کر گُھو گُھو میں گم ہو گیا ہو۔ کبھی کبھی ہُد ہُد بھی آ بیٹھتا اور اپنی ٹک ٹک سے اُسے گدگدیاں کر کے اُس کا دِل لبھاتا۔

پنج ہزاری کے دُکھ کو کوئی پنچھی نہیں سمجھ سکتا تھا اور نہ ہی وہ لوگ جو پنج ہزاری کے بارے میں نوع بہ نوع کی باتیں کر کے اپنے دِل کا بوجھ ہلکا کرتے تھے۔

......❖......
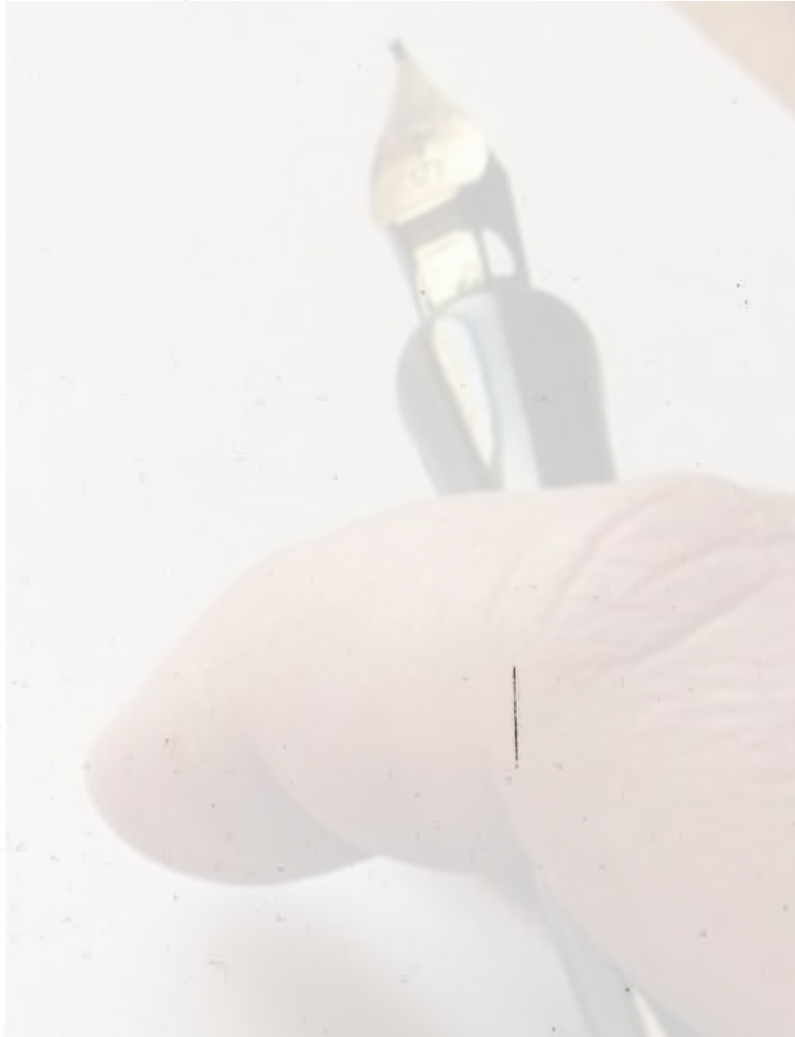
''دوغلی نسلیں...... اُن کی ساری زندگی دوغلی ہوگئی ہے۔ وہ دوغلے نہ اپنے لیے کچھ کر سکے اور نہ ہی اُنھوں نے آنے والوں کے لیے کچھ کیا۔''

''وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ دوغلے جو تھے۔''

''اُن کے خواب بھی دوغلے ہوتے تھے۔''

''اُنھوں نے خواب دیکھے ہی کب تھے!''

''نامُراد! یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''واہ بھئی واہ، نامراد بھی میں ہوں؟''

''مجھے میری نسلوں نے نامُراد بنایا ہے۔''

''کیسے؟''

''وہ بامُراد ہوتے تو ہم نامُراد کیوں ٹھیرتے؟''

''دھاوے کی راتوں میں جنم لینے والے یہی سوچ رکھتے ہیں۔''

''میں...... میں...... حملے سے پہلے پیدا ہُوا تھا۔''

''تمھیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ نسلوں کو گالی دو۔ مجھے تمھاری نسل میں دوغلا پن لگتا ہے۔''

''صرف میری نہیں، سب کی نسلیں دوغلی ہیں۔''

''نہیں، یار۔ یہ تیرا وہم ہے، دوغلا شوغلا پن نہیں ہے۔ نسل باپ سے چلتی ہے۔''

''تبھی تو کہہ رہا ہوں کہ ہر نسل خالص نہیں ہے، ہر کوئی کسی اَور کی نسل ہے۔''

''طاقت وَر کی نسل نہیں ہوتی!''

''کم زور کی کیا ہوگی!''

''کم زور کی ہوتی ہے۔''

''پھر تو یہ ہمارا مسئلہ ہی نہیں۔''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ ہم ہر معاملے کو یہی سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔''

......❖......

بستی والوں کی حیرت اُس روز قابلِ دِید تھی جس روز ایک پختہ عمر کا آدمی آ کر اُس پیڑ تلے بیٹھ گیا۔

وہ آدمی کسی سے بات نہیں کرتا تھا، بس ہر وقت آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا یا پھر پنج ہزاری سے باتیں کرتا رہتا یا کان لگا سننے کی یُوں کوشش کرتا جیسے پنج ہزاری اُس کے ساتھ باتیں کر رہا ہو۔

بستی میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ پنج ہزاری کے نیچے ایک آدمی آ کر بیٹھ گیا ہے اور وہ ہر وقت اپنے آپ بولتا یا سوچتا رہتا ہے لیکن وہ کسی کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا۔ لگتا ہے کہ یہ بخت آور بستیوں میں سے ایک بڑی بستی بن جائے گی۔

بستی والے کب تک چُپ رہتے۔ ایک آدھ فرد اُس کے سامنے سے گذرتے ہُوئے اُس پر نظر ڈالتا اور آگے بڑھ جاتا لیکن ہفتہ دس دِن ہی بیتے ہوں گے کہ لوگ آ کر وہاں بیٹھنے لگے۔

وہ آدمی پنج ہزاری کے سِوا کسی سے کوئی بات چیت نہیں کر رہا تھا۔ آخر ایک روز

ایک بڈّھے نے ہمت کر کے اُس سے پُوچھ ہی لیا۔

''حضور، آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''حضور، آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو پُوری بستی حاضر ہے۔''

اِس پر اُس شخص نے آنکھیں کھولی۔ اُس کی موٹی موٹی لال سُرخ آنکھوں میں کوئی ایسا جلال تھا کہ وہ بڈّھا مزید کچھ نہ کہہ سکا اور وہاں سے چلتا بنا۔

یہ دیکھ کر پنج ہزاری طنزیہ انداز میں مُسکرایا اور اُس کے پتّے ہلکے ہلکے ہلنا شروع ہو گئے جیسے وہ اُس آدمی سے کچھ کہہ رہا ہو۔ بستی والے کچھ دیر کے لیے اُس کے پاس آ بیٹھتے اور کھانا پینا وہاں رکھ جاتے لیکن کسی میں اُس سے بات کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہو رہا تھا۔

......❖......

''جو چیز حقیقت نہ بن سکے وہ خواب بن جاتی ہے۔''

''میں نے خواب کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔''

''اِسی لیے تم حقیقت کے خواب میں ہو۔''

''حقیقت کے خواب میں؟''

''نہیں، یار۔ میں تو اصلی حقیقت میں ہوں۔''

''تمھیں ایسا لگتا ہے۔''

''تم خواب بھی ہو سکتے ہو۔''

''میں......خواب......ہو......سکتا ہوں!''

''خواب ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے!''

''مکمل طور پر جُھوٹ۔ میں جیتی جاگتی حقیقت......خواب کیسے ہو سکتا ہوں؟''

''میرا خیال ہے کہ تم خواب میں پیدا ہُوئے تھے۔''

''اگر میں خواب میں پیدا ہُوا تھا تو دِکھائی کیوں دیتا ہوں؟''

''خواب بھی تو دِکھائی دیتے ہیں۔''

''وہ تو نیند میں دِکھائی دیتے ہیں۔''

''نہیں، میاں۔تم چلتے پھرتے خواب ہو۔''

''ناں، ناں۔ میں نہیں مانتا۔ میں ہر شے کو دیکھ سکتا ہوں، ہاتھ لگا سکتا ہوں، اُٹھ بیٹھ سکتا ہوں اور وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو اصل اور حقیقت میں ہوتا ہے۔''

''یہی تو بات ہے کہ تم اصل نہیں، اصل کا خواب ہو۔ تمھیں جیسا لگتا ہے ویسا نہیں ہے۔ وہ تیرے خواب کا کوئی حِصّہ ہے۔تم چلتے پھرتے خواب ہو، چلتے پھرتے خواب......''

......❖......

''یہ دیکھ۔'' اُس نے اُکتا کر کہا۔

''ہاں، یہ تو واقعی خالی ہے۔ مجھے شک ہُوا ہوگا۔'' یہ کہتے ہُوئے اُس کی نظر عورت کی دُوسری مُٹّھی کی طرف تھی۔

وہ چار قدم ہی چلے تھے کہ جھگڑا کھڑا ہوگیا۔

''میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ میں دُوسری مُٹّھی نہیں کھولوں گی۔''

''اے میاں، کیوں جھگڑ رہے ہو؟''

یہ چاچے ودھو کی آواز تھی۔ اُنھوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ ودھو ایک ٹیلے پر چھڑکاؤ کر رہا تھا۔

''چاچا، خیر ہے؟''

''خیر ہے، پتر۔''

''یہ چھڑکاؤ...... کیا ہُوا ہے؟ کون ہے؟'' مرد نے ایک ہی سانس میں سب کچھ دریافت کیا۔

''خیر ہے میاں، خیر ہے۔ کچھ دیر پہلے یہاں سے گذرتے ہُوئے میری نظر اِس قبر پر پڑی تو میں نے سوچا کہ چھڑکاؤ کر دوں۔''

''قبر تو بہت بڑی ہے۔ کسی بزرگ کی لگتی ہے۔'' مرد بولا۔

''لگتا تو یہی ہے۔'' ودھو یہ کہہ کر دوبارہ چھڑکاؤ کرنے لگا۔ اُس کے ہاتھ سے چھڑکاؤ کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ یہ کام روزانہ کرتا ہو۔ وہ دونوں بھی ودھو کے ساتھ مل کر چھڑکاؤ میں اُس کا ہاتھ بٹانے لگے۔

''چاچا، یہ تو کوئی بہت بڑے بزرگ لگتے ہیں۔'' وہ چھڑکاؤ کرتے ہُوئے بولا۔

''بس میاں، اللہ کا کوئی بندہ ہی ہوگا۔ دیکھو، کہاں آ کر سویا ہے۔ تم دونوں اِس قبر کو اچھی طرح صاف کرو، میں تھوڑا سا اَور پانی لے آؤں۔''

وہ ناہموار قبر کو برابر کرنے لگے۔ چاچا ودھو لوٹ آیا۔ اُس کے کاندھے پر پانی کا گھڑے کے ساتھ ہی ہاتھ میں ایک شاخ بھی پکڑی ہُوئی تھی، جسے اُس نے پہلے سے زمین میں گاڑی ہُوئی شاخ کے ساتھ گاڑ کر پانی ڈالا۔ اِن سب کاموں سے فراغت پا کر اُنھوں نے اجتماعی دُعا کی۔ چاچے نے کہا۔

''پتر، جب بھی یہاں سے گذر ہو تو دُعا ضرور مانگنا اور بستی والوں کو بھی بتا دینا کہ آتے جاتے ہُوئے اِس سے خیر و عافیت کی دُعا ضرور مانگیں۔''

''ٹھیک ہے چاچا۔ ہم یہ پیغام بستی والوں کو پہنچا دیں گے۔'' دونوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

......❖......

شاید دُعائیں اور عبادتیں قبول ہونے لگ گئی تھیں۔

''گھٹا آج گھٹتی دِکھائی دے رہی ہے۔'' ایک بُڑھیا نے اپنی بیٹی سے کہا جو میدان میں دُوسری عورتوں کے ساتھ پہلے سے چھانٹ پھٹک کی ہُوئی گندم کو دوبارہ تیلے سرووں کے چھاج پر چھانٹ رہی تھی۔

اُس کی بیٹی تھوڑی دیر تک آسمان کو تکتی رہی پھر اُس نے اپنی ماں سے کہا۔

''اماں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے بھی یہی لگ رہا ہے جیسے گھٹا پہلے سے گھٹ گئی ہے۔ لگتا ہے کہ ہمارا کنک کو چھانٹنا اپنا اثر دِکھا رہا ہے۔''

''بیٹی، یہ صرف کم ہی نہ ہو پُوری طرح چھٹ جائے تو ہی مجھ بُڈّھی کا سانس ٹھیک ہوگا۔'' لڑکی کی ماں بمشکل سانس لیتے ہُوئے اپنی بیٹی کو دیکھ کر بولی۔ ''تجھے کنک چھانٹنی نہ آئی۔'' ماں نے چھاج کو دیکھتے ہُوئے کہا۔ ''جُوں جُوں چھاج میں کنک کے دانے چھٹکیں گے تُوں تُوں مینہ کے دانے بھی نیچے گریں گے۔''

''اماں، میں چھانٹ تو رہی ہوں۔ تم تو خواہ مخواہ شور مچانے لگتی ہو۔ لگتا ہے اپنی سانس کا غصّہ مجھ پر نکال رہی ہو۔'' لڑکی تیکھے لہجے میں بولی۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو تم آپے سے باہر ہوگئی ہو۔ میں بس اِتنا تو کہہ رہی ہوں کہ چھانٹنے پر دھیان دے تا کہ مینھ برسے مگر تیرے دماغ میں پتا نہیں کیا گھوم رہا ہے۔ پُوری بات سنی نہیں اور لگی ٹرٹر کرنے۔ انسان بن، انسان۔ میں تیری ماں ہوں۔ میں تمھیں نہیں مَت نہیں دوں گی تو کون دے گا؟'' لڑکی کی ماں غصّیلے لہجے میں بولی۔ ''پہلے ہی مجھے سانس نہیں آرہا اُوپر سے تُو تڑاک پڑاک کرنے لگی ہے۔ آج کل تو مَت دینا بھی اُلٹا پڑ جاتا ہے۔''

''بس اماں، بس۔ تم آرام کرو۔ میں اپنا کام خُود کرلوں گی۔ تمھیں یہ سمجھ کیوں نہیں آتی؟'' لڑکی نے ماں کو جواب دیا اور دوبارہ گندم چھانٹنے پھٹکنے لگی۔

''تُو ماں کو مشورے نہ دے، اپنی کام کی طرف دھیان دے۔'' بُڑھیا نے گندم چھانٹتی پھٹکتی دُوسری عورتوں کو دیکھتے ہُوئے کہا۔ ''تا کہ گھٹا سے جان چُھوٹے۔''

...... ❖ ......

گھٹا کو چھٹتا دیکھ کر لوگوں کے مُونھوں پر رونق آ گئی لیکن اب بھی اُن کے اندر دھڑ کا لگا ہُوا تھا۔ خبروں سے اِس دھڑکے کو ختم کرنے میں مدد ملی کہ بادلوں کی پرتیں پتلی ہو رہی ہیں۔ اُمید ہے کہ چند روز میں سُورج نکل آئے گا اور دوبارہ سے دِن رات اپنے اپنے وقت کے مدار میں آ جائیں گے۔ ویسے بھی اب کچھ کچھ اُجالا دِکھائی دینے لگا تھا۔ جس سے پتا چلتا کہ اب دِن ہے۔ لیکن رات ابھی تک گہری تاریکی بھری کالی سیاہ تھی کہ مصنوعی روشنی کے نہ ہونے پر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن اُمید کی کِرن روشن ہو گئی تھی۔

......❖......

ایک مرتبہ اُس نے ایک طوطے والے سے فال نکلوائی۔ طوطے نے چل پھر کر جو لفافہ اُٹھایا اُس پر لکھا تھا۔ ''تم ہوت اور ناہوت کے درمیان رہو گے۔''

اُسے اِس بات کی کوئی سمجھ نہ آئی اور اُس نے دوبارہ لفافوں کے پیچھے بیٹھے چھوٹی سری والے بُڈّھے سے کہا کہ ایک بار پھر فال نکالے۔ طوطا پانچ مِنٹ تک ٹہلتا رہا جیسے اُسے کوئی لفافہ بھی اچھا نہ لگ رہا ہو اور اُس کا سانس بھی اُکھڑنے لگا ہو۔ آخر طوطے نے ایک لفافہ منتخب کیا اور اُڑ کر اُس کے سر پر آ بیٹھا۔ اِس طرح اچانک طوطے کے سر پر بیٹھنے اور اُس کے نوکیلے پنجوں کے چبھنے سے اُس پر ایسی جھرجھری طاری ہُوئی کہ زمین پر گِرتے گِرتے بچا۔ اُسے لگا جیسے اُس کے بدن پر پسینے کی بارش برس پڑی ہو۔ اُس کا دھیان طوطے کی طرف کم اور پسینے کی طرف زیادہ تھا۔ اُس کے دِل میں خیال آیا کہ وہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ پھر پتا نہیں دِل میں کیا آیا کہ وہ بُڈّھے نجومی کے سامنے پڑی سِل پر یُوں بیٹھ گیا جیسے زندگی ہار کر بیٹھا ہو۔

وہ اپنے دھیان میں بیٹھا کہ اُس کے کانوں میں آواز پڑی۔

''دُنیا کے پہلے قاتل کی نسل سے بچ۔ وہ سدا سے تیری دشمن ہے اور تجھے تیرا سچ

ڈبو دے گا۔ اگر تُو اِس مصیبت سے بچنا چا...... ہتا...... ہے......۔"

اُس نے یکا یک وہ کاغذ نجومی کے ہاتھ سے جھپٹ کر دیکھا تو اُسے کچھ بھی دِکھائی نہیں دیا۔ بس یہی نظر آیا کہ لفظ آپس میں لڑ رہے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ کچھ تو لکھا ہُوا نظر آئے مگر لفظ ایک دُوسرے کے پیچھے پڑے ہُوئے تھے۔ ایک سطر کے الفاظ دُوسری سطر کے الفاظ میں گھسے ہُوئے تھے۔

ابھی وہ کاغذ دیکھ ہی رہا تھا کہ نجومی نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔

"یہ کاغذ میں نے پہلے کہاں دیکھا ہے؟" یہ سوال اُس کے دماغ میں کھب گیا۔

...... ❖ ......

اُسے اُداس دیکھ کر کبھی کبھی تو وہ خُود بھی افسردہ ہو جاتی تھی۔ اُسے خاص طور پر اُس وقت اُس پر پیار آتا جب وہ آدھی رات کو اپنے بستر سے نکل کر ٹہلنے لگتا تھا۔ پتا نہیں کیا سوچ رہا ہے؟ وہ اُس کے ماتھے پر پڑی لکیروں کو دیکھ کر سوچنے لگتی۔ لگتا ہے کہ سوچ کی بیماری اِسے سونے نہیں دے رہی ورنہ کون ہے جو آدھی رات کو اپنا بستر چھوڑے اور اپنے خیالوں میں گم ہو کر پھرے؟

اِس کی قسمت میں نیند نہیں لگتی۔ سوچیں نیند کو کھا جاتی ہوں گی، تب ہی تو بے وقت اپنے خیالوں میں غرق ہو جاتا ہے۔ ایسے لکھنے کا کیا فائدہ جو آدمی کی نیند اُجاڑ دے؟ یہ تو بے خوابی کا عادی ہو گیا ہے۔ لیکن مجھ بے چاری کا کیا قصور ہے؟ مجھے بھی تو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ کوئی نہ کوئی کاغذ میرے شکم میں پھینکتا رہتا ہے۔ اِتنے عرصے سے کام میں جتا ہُوا ہے، کچھ نہ کچھ تو لکھا ہی ہو گا!

ہم نے تو بے شمار لکھاریوں کو دیکھا ہے، وہ اپنی لکھتیں سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ اِس کی طرح ڈھیر کے ڈھیر پھینکتے نہیں۔ خیر، اِس کی مرضی، جو چاہے سو کرے۔ میری تقدیر ہی ایسی ہے کہ اِس جیسے فضول آدمی سے پالا پڑا ہے۔ کسی اَور گھر میں ہوتی، صاف

ستھری تو رہتی۔ اِس نے تو کبھی میری طرف توجہ بھی نہیں دی۔ شکر ہے، طیش میں آ کر مجھے ٹھڈّے نہیں مارتا۔ ایسے آدمی ایسے کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ غصہ کسی کا، نکالتے کسی پر ہیں۔

اُس کی نگاہ اُس پر پڑتی ہے تو اُسے لگتا ہے کہ وہ اپنی سوچ میں اِس قدر منہمک ہے کہ اُس کے ایک پیر کا جوتا اُتر گیا لیکن اُسے خبر تک نہیں۔ وہ ٹہل رہا ہے۔

آج تو کوئی انوکھی سوچ ہی لگتی ہے۔ میں نے اِسے پہلے کبھی اِتنا بجھا ہُوا اُور اُداس نہیں دیکھا، بے چارہ...... ! کچھ لکھنے کا سوچ رہا ہوگا۔ لیکن اُداس کیوں ہے؟

...... ❖ ......
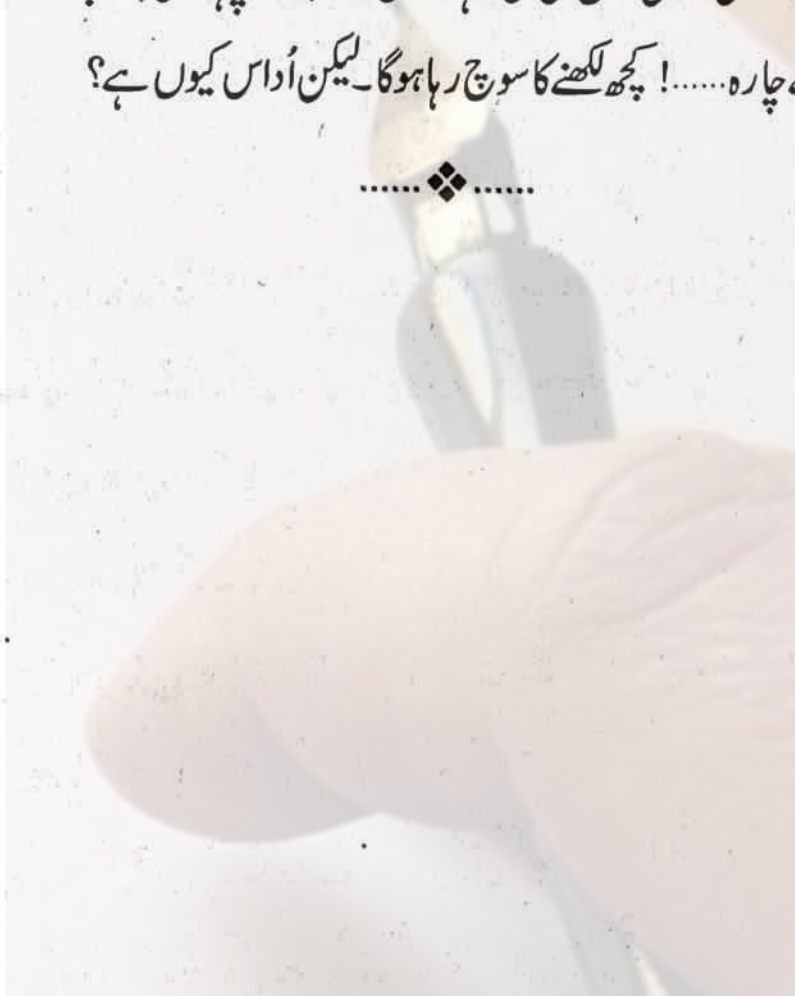
اُس برس پنج ہزاری پہلے سے زیادہ خُوب صُورت اور نیا نیا لگ رہا تھا۔ کچھ تو یہاں تک کہہ رہے تھے کہ اُس برس وہ پانچ ہزار ایک سال کا ہو گیا ہے۔ اِسی لیے اُس کی ہریالی اور حسن و جمال بڑھ گیا ہے۔

''پانچ ہزار ایک سال!''

پنج ہزاری کے پتّے لشکارے مار رہے تھے اور اُن پر نئے جوبن کا حسن صاف دِکھائی دے رہا تھا۔

اُس کی نظر ہر آنے جانے والے پر تھی لیکن اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کیوں کہ وہ ایسی جگہ پر تھا جہاں کسی نگاہ کی رسائی نہیں تھی اور نہ ہی ہو سکتی تھی۔

دڑ دڑ کی آواز اُس کی سماعت تک پہنچتی ہے۔ وہ اشتعال میں آ کر کانپنے لگتا ہے۔ ہر آواز اُس کے کانوں کے اندر آ رہی تھی۔ وہ غصّے سے دیکھتا رہا۔

''دِکھائی تو کچھ نہیں دے رہا۔''

''پھر یہ آواز کیسی تھی؟''

اُس کے پتے آگے بڑھ بڑھ کر دیکھنے لگتے ہیں لیکن سامنے سے کوئی آواز نہیں آتی۔

''باہر کوئی آواز نہیں۔''

''پھر کہاں سے آرہی ہے؟''

اُس کی نظر دھاوا بولنے والوں پر تھی۔

......❖......

''طاقت وَروں کی تاریخ میں سچ ہوتا ہے؟''

''سچ تو خود تاریخ ہوتی ہے۔''

''لیکن ہمیں سچ نہیں لگتی۔''

''سچ یا تاریخ؟''

''سچ، سچ ہوتا ہے۔ وہ تاریخ کا محتاج نہیں۔ لوگ اُسے سامنے لے ہی آتے ہیں۔''

''نیچ ذاتوں کی تاریخ کیوں نہیں ہوتی؟''

''ہوتی ہے۔ اُسے سامنے آنے نہیں دیا جاتا۔ پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔''

''نیچ تو نیچ ہوتا ہے۔ وہ تو خود چھپتا پھرتا ہے۔ اُس کی تاریخ کیوں پوشیدہ رکھی جاتی ہے؟''

''یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ اِس کے پیچھے ایک سازش ہے جس کی تمھیں سمجھ نہیں آئے گی۔''

''میں نیچ کی بات پوچھ رہا ہوں۔''

''مجھے پتا ہے۔''

''تاریخ کا سچ کیا ہوتا ہے؟''

''ہمارے ہاں تو تاریخ کا سچ نہیں ہوتا، جھوٹ ہوتا ہے۔''

''جھوٹ کی تاریخ ہوتی ہے؟''

''ہماری ساری تاریخ جھوٹ ہے۔''

''تاریخ تو بڑے بڑے لوگ لکھتے ہیں۔''

''لکھتے ہوں گے۔ ہر بڑے آدمی نے طاقت وَر کے کہنے پر تاریخ لکھی ہے۔''

''یا طاقت وَر نے خُود لکھوائی ہے۔ اور اپنی منشا کے مطابق لکھوائی ہے۔''

''کہتے ہیں کہ سربراہوں اور حاکموں کی تاریخ سچ ہوتی ہے۔''

وہ ہنس پڑتا ہے۔

''تم اب بھی بچے ہو۔''

''لیکن ہماری تاریخ بچے نہیں۔''

......❖......

وہ کاغذ کو رکھ کر اپنے آپ کے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتا ہے لیکن اُس کی آواز نہیں نکلتی۔ وہ زور لگا کر بولنے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن اُس کے مُنھ سے اُوں آں کے سِوا کچھ نہیں نکلتا۔ وہ اپنی پُوری قوّت لگا کر کچھ کہنا چاہتا ہے کہ اُسے زور کا چکّر آتا ہے اور وہ بے سدھ ہو کر بستر پر، گر پڑتا ہے۔

''میں بولنا تو نہیں بُھول گیا؟''

''اگر میں بول نہیں پایا تو کیا کچھ لکھ بھی نہیں سکوں گا؟''

''میرا کیا بنے گا؟''

....

اُس کا سر ماں کی گود میں ہے۔ ماں اُسے لوریاں دے رہی ہے۔ وہ اُسے کہانی سنانے کے لیے کہتا ہے۔ ماں اُس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہُوئے کہانی سنانے لگتی ہے۔

ایک تھا بادشاہ۔ اصل بادشاہ تو اللّٰہ ہے لیکن کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اُس کی رعایا اُس کے قہر سے تنگ تھی۔ بادشاہ کو جنگیں لڑنے کا شوق تھا...... اُس کی تمنّا تھی کہ وہ

ساری دُنیا کا بادشاہ بن جائے...... دِھیرے دِھیرے وہ سونے لگتا ہے۔ اُس کے کانوں میں ماں کی آواز آرہی ہے۔ آنکھیں خُود بخود نیند سے بند ہوتی جارہی ہیں۔ ماں اُس کا سر اپنی گود سے اُٹھا کر تکیے پر رکھتی ہے۔
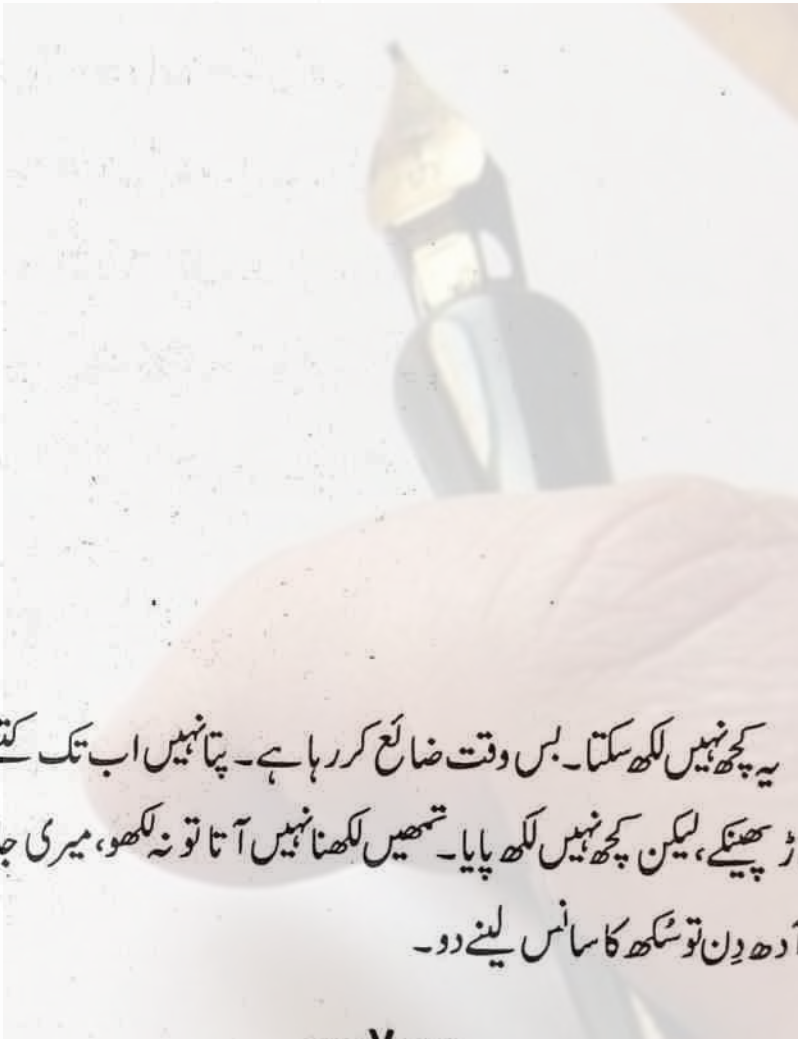
وہ سویا ہُوا ہے۔ ماں گھر کے تام جھام میں جتی ہُوئی ہے۔

''اماں!'' وہ نیند میں پکارتا ہے۔

''اماں!'' وہ دوبارہ نیند میں پکارتا ہے۔

وہ ''اماں، اماں'' پکارر ہا ہے۔ کوئی جواب نہیں آتا۔ ایک بادشاہ تھا۔ اُسے ساری دُنیا پر بادشاہی کا شوق تھا۔ اُس نے بہت سی جنگیں لڑیں...... اور وہ اپنے ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہو گیا...... ایک بادشاہ...... غلام...... رعایا...... قہر...... غلام...... خُوش...... نہ......

......❖......

یہ کچھ نہیں لکھ سکتا۔ بس وقت ضائع کر رہا ہے۔ پتا نہیں اب تک کتنے ہی ڈھیر لکھ
لکھ کر پھاڑ پھینکے، لیکن کچھ نہیں لکھ پایا۔ تمھیں لکھنا نہیں آتا تو نہ لکھو، میری جان بخش دو۔
مجھے ایک آدھ دِن تو سُکھ کا سانس لینے دو۔

......۷......

ایک عورت اور ایک آدمی چلتے ہُوئے آپس میں لڑتے جا رہے تھے۔ آدمی کو غصّہ آ گیا۔ وہ بولا۔ ''مجھے یہ بتاؤ، میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ تمھارا مُنھ بن گیا ہے؟''

''اچھا، ابھی تم نے کچھ کہا ہی نہیں!'' وہ بولی۔

''کیا کہا ہے؟''

''بات تم نے کی ہے، پُوچھ مجھے رہے ہو! یہ کام تمھیں آتے ہیں کہ......!''

''مجھے آتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

عورت نے آدمی سے آگے نکل کر اپنی رفتار بڑھا دی۔

''مردود، اب کچھ بتاؤ گی بھی، تمھیں کون سی بات بُری لگی ہے؟'' آدمی بولا۔

''آگ لگے، اپنی بہن سے پُوچھو۔ وہ تو مجھے طعنے مارے سو مارے، تم بھی اُس کے ساتھ مل کر مجھ بے چاری کو طعنے مارتے ہو۔''

''میں اُس کے ساتھ کب ملا ہوں؟ میں نے تو حق بات کی تھی۔''

''تمھاری باتیں ہی حق ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے گھر کرنے کیا آئی ہے؟ جائے اور جا کر آپ اپنے خاوند کو منائے۔''

''صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمھیں میرے بہن کے آنے کا دُکھ ہے۔''

''مجھے کیا دُکھ ہونا ہے؟ کھائے بھی ہمارے اور ٹوکیں بھی ہمیں مارے! یہی کام تیری ماں کرتی تھی اور یہی کام یہ کر رہی ہے۔''

''چھوٹی چھوٹی باتوں پر تمھیں ناراض ہونا خوب آتا ہے۔'' آدمی کا یہ کہنا تھا کہ اُس کی رفتار اَور بڑھ گئی۔

''بھاگ کر کہاں جا رہی ہو، بات تو سنو۔''

''میں نہیں سنتی۔'' ابھی اُس نے اِتنا ہی کہا تھا کہ اُس کی نگاہ رَیت میں کسی چمکتی ہُوئی شے پر پڑی اور اُس نے دوڑ کر اُسے اُٹھا لیا۔

''انگوٹھی ہے، سونے کی لگتی ہے۔ اِس نامُراد نے تو مجھے آج تک کوئی چیز نہیں دی، اللہ نے خُود ہی دے دی ہے۔''

اِسی دوران میں آدمی اُس کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ اُس کی بیوی نے رَیت میں سے کوئی چیز اُٹھائی ہے۔

''کیا مل گیا کہ اِتنی خُوش ہو رہی ہو؟''

''کچھ نہیں، مجھے کچھ نہیں ملا۔'' یہ کہتے ہُوئے اُس نے انگوٹھی دبوچ کر اپنی مُٹھی میں چھپا لی۔

وہ بھی آخر شوہر تھا۔ ہنستے ہُوئے بولا۔ ''چلو، مان لیا تمھیں کچھ نہیں ملا۔ لیکن اپنی مُٹھی تو کھول!''

اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مُٹھیاں بنائی ہُوئی تھیں۔ اُس نے کھلکھلاتے ہُوئے خالی مُٹھی اُس کے سامنے کھول دی۔

......❖......

اُس کے اندر الکس بھری ہُوئی تھی یا شاید الکس اُس کے اندر بیٹھی اُسے چاٹ رہی تھی۔ اُس کا اپنا خیال تھا کہ وہ جتنا الکس سے بھاگتا ہے اُتنی ہی وہ اُس کے وجود میں گھستی ہے۔ لیکن یہ تو الکس نہیں ہے، آدمی کا جس کام کو دِل نہ چاہے وہ اُسے نہیں کرنا چاہتا۔ زبردستی کرنے سے کام ٹھیک ہونے کے بجائے اُلٹا خراب ہو جاتا ہے۔

اُس نے کاغذ قلم رکھ کر باہر دیکھا۔ لوگ اپنے اپنے کام کاج میں جتے وہاں سے یُوں گذر رہے تھے جیسے نیند میں چل رہے ہوں یا کوئی ڈر اندر اندر ہی اُنھیں اشتباہ کر رہا ہو۔

اگر اُنھیں پتا چل جائے کہ میں......؟

وہ ہنسنے لگا اور اُس کا ٹُوٹا ہُوا خیال جُڑ کر دوبارہ کاغذ پر اُترنے لگا۔

یہ بے چارے اِس بات کو کیا سمجھیں گے؟ یہ تو بس اپنے آپ کو لیے پھر رہے ہیں۔ لگتا ہے اُن کی رُوح مرتی جا رہی ہے۔ یا پھر وہ یہاں پیدا ہی بے رُوح ہُوئے تھے۔

''اپنی دھرتی پر کوئی بھی بے رُوح نہیں ہوتا۔''

''پھر یہ یہاں کے نہیں ہوں گے!''

''رُوح کا زمین کے ساتھ کوئی رشتہ ہوتا ہے؟''

''زمین ہی سے ہوتا ہے۔ باقی تمام رشتے تو عارضی ہوتے ہیں۔ موت کے بعد تو یہ رشتہ کم زور پڑ جاتا ہوگا؟''

''کم زور پڑ نہیں جاتا، ہوتا ہی کم زور ہے۔ جیتے جی بھی اور مرنے کے بعد بھی۔''

روایت ہے کہ خُوشیاں تو اُسی روز ختم ہو گئی تھیں جس روز پہلی جنگ ہُوئی تھی۔ راوی تو یہ روایت بھی کرتے ہیں کہ اُس جنگ کی چیخیں آج بھی فضا میں رچی بسی ہُوئی ہیں اور کئی لوگوں کا خیال ہے کہ جب بھی جنگجو اپنی دھرتی کو چھوڑ کر زمین کے کسی دُوسرے حصّے پر چڑھائی کی نیت پیر رکھتے ہیں، زمین کانپ اُٹھتی ہے اور کچھ کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ کوئی چیخ فضا میں گُونجتی رہتی ہے اور جب جارِح آتے ہیں تو وہ خُود اُنھیں بلاوا دیتی ہے کہ آؤ، مجھے ظالموں سے بچاؤ۔ بتانے والے تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ کبھی کبھی پنج ہزاری کی جڑیں بھی چلّاتی ہیں۔ لیکن وہ اِن سب کو لوگوں کی من گھڑتیں سمجھتا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ زمین خُود حملہ آوروں کو بلاوا بھیجے؟ پنج ہزاری کا قِصّہ تو عین جھوٹ لگتا تھا کہ پیڑ کی جڑوں میں سے چیخیں نکلتی ہیں۔ لوگ ایسی باتیں گھڑ کر اپنے سہم کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اُس کا خیال تھا کہ جہاں کہیں کوئی قدیم درخت یا حویلی یا قلعہ ہو وہاں اِس قسم کی کہانیاں عام ہو جاتی ہیں اور لوگ بات کو اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر نئے قصّے شامل کر لیتے ہیں۔

''پیڑ کی جڑیں کتنی پھیلی ہوں گی؟''

''پانچ ہزار برسوں جتنی پھیلی ہوں گی۔''

''ہر چیز بدل گئی ہے لیکن یہ پیڑ نہیں بدلا۔ اِس کے بارے میں ہر شخص کی یہی رائے تھی کہ وہ جب سے اِسے دیکھ رہا ہے ایسا ہی دیکھ رہا ہے۔''

''جیسے کا تیسا تو نہیں رہ سکتا۔ اِس کی داڑھی اِتنی بڑی ہے کہ اُس کے گھیر میں سالم

شہر سما جائے۔''

''اِس کی عمر اِتنی نہیں لگتی جتنی لوگ بتاتے ہیں۔''

''اِتنی نہ ہوگی کچھ سال کم ہوگی۔ لوگ کافی غلط بیانی کا م لیتے ہیں۔''

''مجھے تو ہر بات ہی جھوٹ لگتی ہے۔''

......❖......
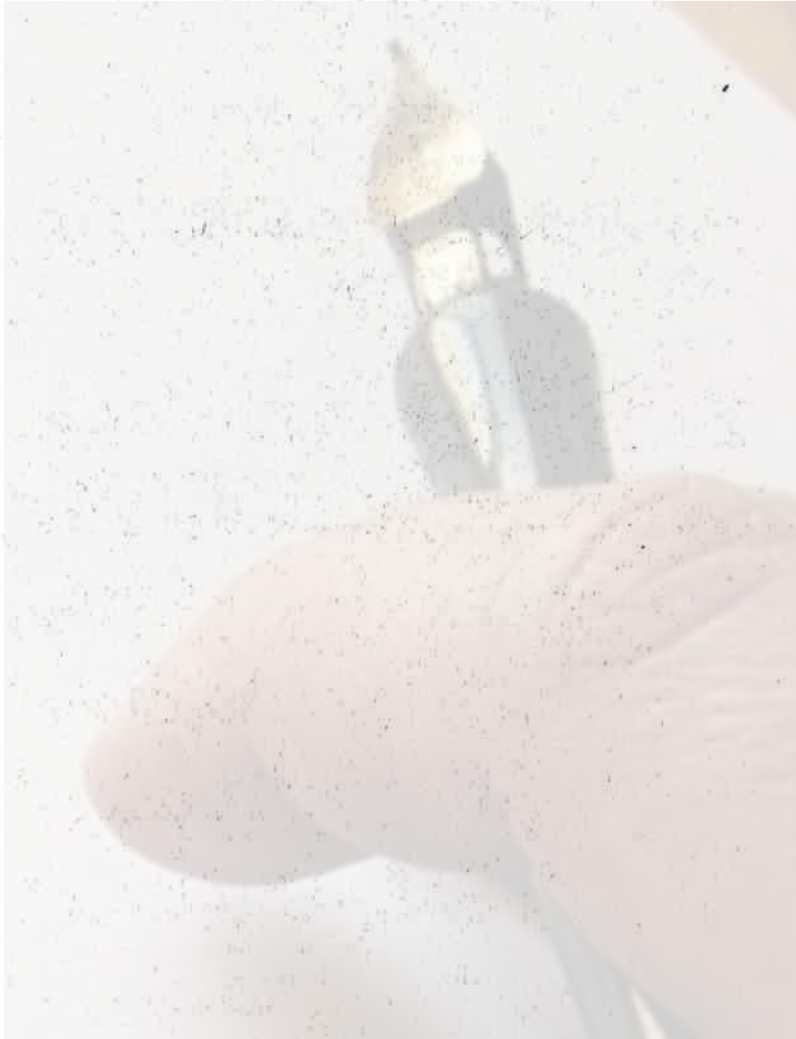
''میں اُس نسل کا وارث ہوں جس نے جارِحوں کا تعاقب کر کے اُنھیں مار بھگایا

تھا۔''

''جنگ تو پھر بھی ہُوئی تھی۔''

''ہُوئی تھی لیکن پہلی جنگ میں میری نسل کے ایک سربراہ نے مار مار کر اُن کا

بھرکس نکال دیا تھا۔''

''وہ اکیلا تو نہیں تھا!''

''چاہے بے شمار تھے۔''

''اُنھیں مارنے میں پہل تو ہم نے ہی کی تھی۔''

''تم بھی تو مرے تھے!''

''گو ہم بھی مرے تھے لیکن اُنھیں مار بھگانے میں پہل ہم ہی نے کی تھی۔''

''ہم یُوں ہی اِس دھرتی کے باسی نہیں کہلاتے۔ ہم ماں کی وصیت کے مطابق

اُس کی حفاظت پر معمور ہیں۔''

''ایک دفعہ کسی کو بھگا دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

''ایک دفعہ! کچھ نہیں ہوتا؟'' اُس کا مُنہ غصّے سے لال ہو گیا اور اُس کے پُورے جسم میں گویا بجلی بھر گئی۔

''تمھارے بڑے تو ہمیشہ سازشوں میں اُن کے شریک رہے۔ تمھاری وجہ سے آج ہمیں یہ دِن دیکھنا پڑ رہے ہیں۔''

''تم......تم...... اِس قابل نہیں تھے......تم خوشامدی ہو......تم نے تمام وہ کام کیے......جو......تم لوگ حکمرانوں کے گھوڑوں کی دُمیں اُٹھا اُٹھا کر یہاں تک پہنچے ہو۔ تمھیں اصل باسی نہیں کہا جا سکتا......تم نے اِس دھرتی کو بیچ...... بانٹ ....

....

....

اُس کے مُنہ سے کف بہنے لگا۔

......❖......

حسو کی بہو بیمار کیا پڑی کہ سارے کنبے کی جیسے بُھوک ہی مر گئی۔ حسو اور اُس کے خاندان والے ہر روز کوئی جڑی بُوٹی، کوئی پُڑیا لاتے کہ وہ کسی طور تندرست ہو جائے۔ کوئی کہتا کہ اُسے شہر کے بڑے ڈاکٹر کو دِکھاؤ تو کوئی مرچوں کو سر کے اُوپر سے وارنے اور کوئی دم درود کروانے کا مشورہ دیتا۔ ڈاکٹر کے پاس حسو کی بہو جانا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ اُسے ڈاکٹری علاج میں ٹیکے سے ڈر لگتا تھا۔ وہ روزانہ اُسے حکیم کی پُڑیاں اور جڑی بُوٹیاں کھلاتے لیکن کوئی فرق پڑتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

خُدا بھلا کرے ماسی کریمن کا، جو آٹے کی پڑوپی مانگنے آئی تو اُس نے دیکھا کہ حسو کے سارے گھر والوں کا مُنھ اُترا ہُوا ہے۔ اُس نے حسو کی بیوی سے دریافت کیا۔ ''بیٹی، خیر تو ہے۔ سارا کنبہ پریشان دِکھائی دے رہا ہے؟''

حسو کی بیوی بولی۔ ''ماسی، خیر کیا ہے! آج مہینا بھر ہو گیا، وَسو کی بیوی کسی عجیب و غریب بیماری کا شکار ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر کو یہ نہیں دِکھاتی اور حکیموں کی پُڑیاں کھا کھا کر ادھ موئی ہوئی پڑی ہے۔''

''بیماری کیا ہے؟ مجھے بتاؤ؟'' کریمن نے استفسار کیا۔

''بیماری کیا بتاؤں، کہتی ہے مجھے اپنے ہاتھوں سے بُو آتی ہے اور ہر وقت صابن

لیے ہاتھ دھوتی رہتی ہے۔''

''بیٹی، یہ بیماری نہیں وہم ہے۔'' کریمن بولی۔

''میں بھی یہی کہتی ہوں لیکن میری سنتا کون ہے۔ حسو اور وَسو اِسے بیماری سمجھ کر حکیموں کے در کے چکّر پر چکّر لگا رہے ہیں۔ حسو کی بیوی نے یہ بات اِس قدر دِھیمی آواز میں کہی کہ کوئی اَور نہ سُن پائے۔

''اگر میری مانو تو اِسے آدھی رات کو 'اتوار کے دربار' پر لے جاؤ۔ وہاں مَنّت مانگو، یہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' کریمن نے بھی دِھیمے لہجے میں صلاح دی۔

''اتوار کا دربار؟ میں نے اِس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔ یہ کہاں ہے؟'' حسو کی بیوی مستفسار ہُوئی۔

''کمال ہے، تمھیں اِس کا نہیں پتا۔ ساتھ والی بستی کے مشرق کی جانب تین کوس پر وہ دربار ہے۔ وہاں جاؤ، یہ ٹھیک ہو جائے گی۔''

''ماسی، تم اُس دربار پر گئی ہو؟''

''ہاں بیٹی، میں ہر اتوار کو وہاں جا کر گھی کے دیے جلاتی ہوں۔ تمھیں تو پتا ہے کہ میرے بیٹے کو بھی وہم ہو گیا تھا کہ کوئی دشمن ہر وقت اُس کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ میں اُسے وہاں لے گئی تھی اور آدھی رات سے صبح ہونے تک وہاں رہی تھی۔ میری مُراد پُوری ہُوئی۔ وہ دِن اور آج کا دِن، اتوار کا کوئی دِن ایسا نہیں گذرا جب میں وہاں نہ گئی ہوں۔ وہاں اچھے خاصے لوگ آ کر رہتے اور اپنی مُرادیں پاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر کریمن پڑوپی اُٹھا کر چلی گئی۔

''مجھے تو اِس دربار کے متعلّق پتا ہی نہیں اور نہ ہی کبھی حسو اور وَسو نے اِس کا ذکر کیا ہے۔ حسو کے آتے ہی میں اُسے بتاؤں گی۔'' حسو کی بیوی وہاں جانے کا پختہ ارادہ کیے بیٹھی تھی۔

......❖......
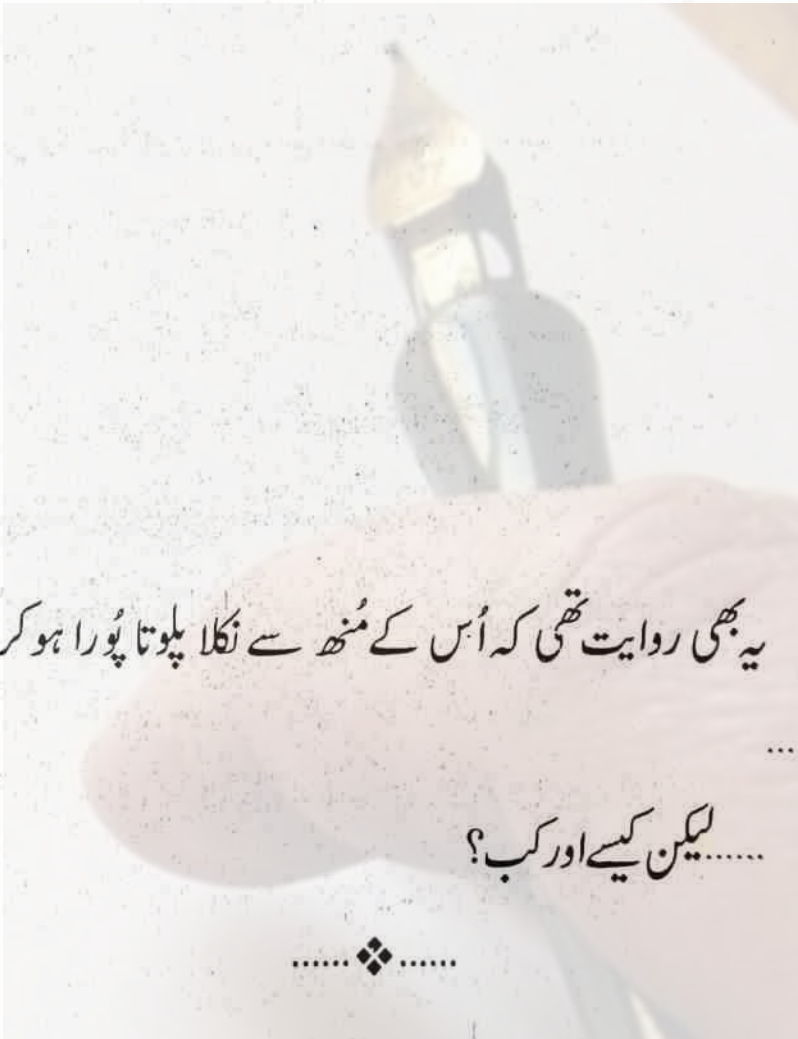
کچھ لوگوں کا خیال تھا کے جُوؤں اور لیکھوں کو دھاوے والے روز حملہ آور اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اُس سے پہلے وہاں اُن کا نام ونشان تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ جُوئیں اور جلمیں آدھی رات پڑنے پر اُن ''خاص'' درختوں کی طرف جاتیں۔ یُوں لگتا تھا جیسے اُن کی فوج اُن درختوں کو سلام کرنے جاتی ہے یا پھر اُن کا کوئی اَور مقصد ہے۔ اِس کا پتا تب ہی چل سکتا تھا جب کوئی خُود اُنھیں بہ چشمِ خُود دیکھتا۔

ایک آدھ کا کہنا تھا کہ وہ اپنا سارا لہو اُن کی جڑوں کو پلاتی ہیں۔ لیکن باقی سب کو اِس بات پر یقین نہیں تھا کیوں کہ اگر وہ اپنا خُون اُن کی جڑوں کو پلا دیتی تھیں تو خُود کیسے زندہ تھیں؟ اُن کی تو خوراک ہی لہو ہے، اِس کے بغیر تو وہ زندہ رہ ہی نہیں سکتیں۔

ویسے یہ ایک عجیب بات تھی کہ جُوئیں اور لیکھیں اپنا خُون اُن پیڑوں کو دان کرتی تھیں لیکن کس کے حکم پر؟ اِس کا تو ایک ہی مطلب نکلتا تھا کہ اُن کا اُن خاص درختوں سے کوئی گہرا رشتہ ہے۔

......❖......

یہ بھی روایت تھی کہ اُس کے مُنھ سے نکلا پلوتا پُورا ہو کر رہے گا۔

لیکن......

......لیکن کیسے اور کب؟

......❖......

میرا خواب آسمان کے ساتویں کونے میں بیٹھا ہے اور میں زمین کے پہلے کونے میں۔ ساتواں کونا مینھ کو گھیرے میں لیے ہُوئے ہے۔ خواب کے چاروں طرف دُھند اکٹھی ہورہی ہے۔

آہستہ آہستہ پہلا کونا ختم ہونے لگتا ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ میں بھی۔ میں ختم ہوتے ہُوئے کونے میں بیٹھا ہوں۔ مجھے زمین اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ میں کسی کونے کا حِصّہ نہیں ہوں۔ میں زمین کا پیندا بنتا جا رہا ہوں۔

میں کسی جگہ کا حِصّہ نہیں ہوں کیوں کہ زمین اپنے نچلے حصّے کو پکڑنے کے لیے نیچے جھکتی چلی جارہی ہے۔ میرے سینگھوں پر زمین سما نہیں رہی۔

آسمان سے بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نیچے اُتر رہا ہے۔ میں اُس کی آس لگائے بیٹھا ہوں۔ ہزار برسوں میں بھی وہ میرے پاس نہیں پہنچا۔ میں جب بھی اُس کی طرف دیکھتا ہوں مجھے لگتا ہے جیسے وہ لحظہ بھر میں میرے ہاتھ میں ہوگا۔

قلم اُس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر پڑا۔

......❖......

اُس کے سامنے گھوڑوں، ہاتھیوں پر سوار فوج کسی ایسے مقام کی سمت دوڑتی چلی جارہی ہے جہاں آج رَن پڑنے کا خطرہ ہے۔

اُس نے یہ سارا منظر دیکھا۔ آج ایک بڑی فوج جارہی ہے۔ ہاتھیوں پر لمبی اور ٹھوس نال والی نئی مشینیں بھی لدی ہُوئی ہیں اور کئی ہاتھیوں پر موٹے موٹے بھاری پتھر۔ اِس طرح لگتا ہے جیسے وہ پتھر پھینکنے والی مشینیں ہوں جن سے بہت تباہی و بربادی ہوگی۔ خُدا خیر کرے!

پیڑ کی ٹہنیاں وہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اُس کا خیال تھا کہ آج گھمسان کا رَن پڑے گا لیکن کہاں؟ وہ پریشان ہوگیا۔ اُس کے پتّے آپس میں ٹکرانے لگے جیسے بہت تیز آندھی چل پڑی ہو۔ لیکن وہاں تو ہَوا کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ اُس کے پتّے یُوں سخت ہو گئے تھے جیسے اشتعال میں آ گئے ہوں۔

وہ گھوڑوں اور ہاتھیوں کی آوازیں سن رہے تھے۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود دیکھ رہا تھا۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے سالم پیڑ ہلنے اور شور مچانے لگا ہو۔ اُسے وہ مناظر یاد آنے لگے جو اُس کی نگاہوں کے سامنے اِس طرح موجود تھے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا!

اُس کا دِل گھٹنے لگا ہو۔ اُس نے سوچا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نہیں ہونا چاہیے مگر اُس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔

اگر چہ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ سوچ میں پڑا ہُوا تھا۔

پتّوں سے آنسوؤں کے ٹپکنے کی آواز آتی ہے۔

......❖......
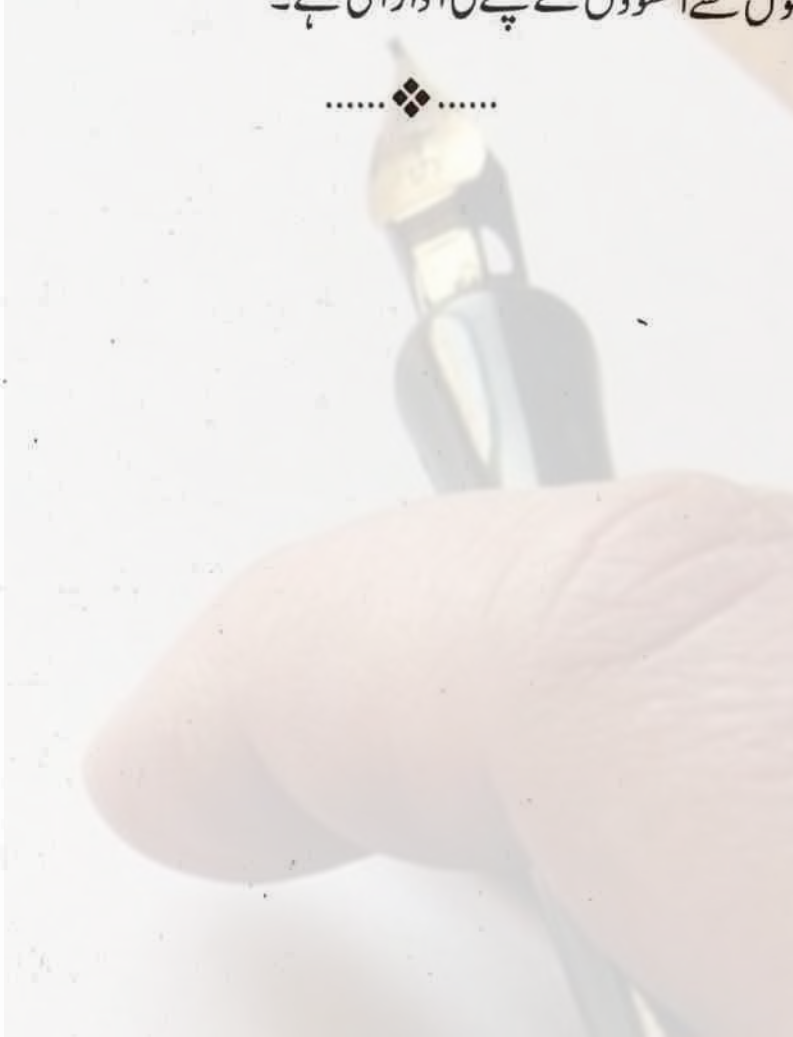
''اِس کا کوئی اَنت ہوگا؟''

''بے اَنت کا کوئی اَنت نہیں ہوتا۔''

''لگتا ہے تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔''

''مطلب کا بھی کوئی اَنت نہیں ہوتا۔''

''تم پتا نہیں کس سوچ میں کھوئے ہُوئے ہو۔''

''میں یہ کہہ رہا ہوں، جو ہونے والا ہے اُس کا کوئی اَنت ہے؟''

''کیا؟ کیا ہونے والا ہے؟''

''مجھے کچھ دِنوں سے یُوں لگ رہا ہے جیسے......!''

''کیا لگ رہا ہے؟''

'' کچھ ایسا ہونے والا ہے جس تک کسی کی سوچ کی رَسائی نہیں۔''

''تم اپنا علاج کراوٗ۔ تمھاری دماغ بنجر اور بے کار ہوتا جا رہا ہے۔''

''تمھیں میں بیمار لگتا ہوں؟''

''تمھاری خرافات سے تو یہی لگتا ہے۔''

’’نہیں، مجھے کبھی کبھی لگتا ہے جیسے......!‘‘

’’جیسے......ہم اپنے دُشمن خُود ہو گئے ہیں!‘‘

’’تم اپنے دُشمن خُود ضرور ہو، باقی کسی کا مجھے پتا نہیں۔ ایسے ہر بات قیاس نہ کرلیا کرو۔ یہ تمھیں بیمار کر ڈالیں گے۔‘‘

’’میں قیاسات نہیں لگاتا۔‘‘

’’پتا نہیں، مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ......!‘‘

......❖......
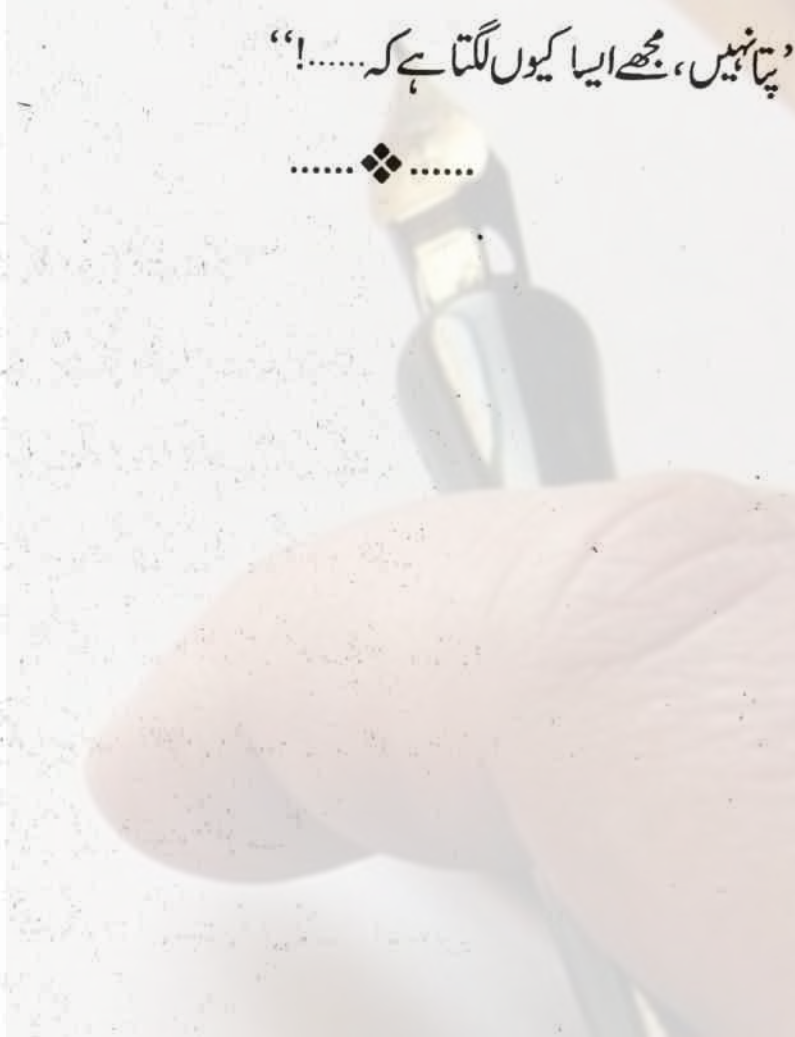
حسو کی مُراد کیا پُوری ہُوئی کہ اُس کے گھر میں باجوں تاشوں کا دھوم دھڑکا تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ڈھول والا گُھوم گُھوم کر ڈھول بجا رہا تھا اور بستی والے جُھوم مرڈال رہے تھے۔ وَسو کے روئیں روئیں سے مسرت پُھوٹ رہی تھی اور وہ لوگوں سے گلے مل مل کر قہقہے لگا رہا تھا۔ حسو کی بیوی اور بہو ایک دُوسرے کے مُنھ چُومتے ہُوئے آنے والی مہمان عورتوں کو گلے مل مل کر خُوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

تھالوں میں لوگوں کے درمیان بٹتی ہُوئی میٹھی روغنی روٹیوں کی خُوش بُو بستی بھر میں پھیلی ہُوئی تھی۔ حسو اور وَسو دونوں تھال اُٹھائے مزار پر ہر آنے جانے والے کو خُود اپنے ہاتھوں سے تقسیم کر رہے تھے۔ شام تک وہاں میلا لگا رہا۔ وہاں سے تمام گذرنے والوں کے ہاتھوں میں میٹھی روغنی روٹیاں تھیں۔ بچ رہنے والی روٹیاں اُنھوں نے پرندوں کے لیے چھوڑ دیں۔

مُراد پُوری ہونے کے بعد وَسو نے اُس مزار کی تزئین و آرائش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

……❖……

پنج ہزاری کیا تھا؟

وہ ایک عجیب وغریب پیڑ تھا۔ جس کے پتّے بہت بڑے بڑے اور سیاہی مائل سبز رنگ کے تھے۔ اُس کی قامت اِس قدر بلند تھی کہ لگتا تھا کہ ایک روز وہ آسمان کو چھُو لے گا۔ اُس کے گھیر میں ایک بڑی بستی بسائی جا سکتی تھی۔ اُس کے پتّے کڑک اور دُور سے دیکھنے پر بنفشی رنگ کی جھلک دیتے تھے۔ وہ پیڑ وہاں ہزار ہا برس سے موجود تھا۔

سیانے بتاتے تھے کہ قدیم زمانے میں اُس جیسے درخت بہت بڑی تعداد میں ہُوا کرتے تھے لیکن نئی آبادیوں کے معرضِ وجود میں آنے اور حملہ آوروں کے دھاووں کی وجہ سے وہ ناپید ہو گئے تھے۔ اب وہ ایک ہی قدیم پیڑ بچا تھا جو اُس بستی میں کھڑا تھا۔ اُس پر طوفانِ بادوباراں سمیت کسی ارضی وسماوی آفت کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے سائے میں بیٹھ کر راحت ملتی تھی۔ وہ دُور ہی سے دِکھائی دیتا تھا اور رَات کو راستہ بُھول جانے والوں کے لیے تو قطبی تارے کا کام بھی دیتا تھا۔

درحقیقت پنج ہزاری ایک خُوب صُورت اور منفرد پیڑ تھا لیکن لوگ اُسے درخت کہنے کے بجائے احترام سے پنج ہزاری کہتے تھے۔ جس نے ہر طرح کے نشیب وفراز، دُکھ

سُکھ، سرد و گرم، اُونچ نیچ، مختلف زمانوں کے ہر طرح کے لوگ باگ اور اُن کے رسوم و رواج دیکھے تھے۔ اُس کا نام پنج ہزاری ایسا پک گیا تھا کہ اب اگر وہ چھے ہزار یا دس بارہ ہزار سال کی عمر کا بھی ہو جاتا تو بھی لوگ اُسے پنج ہزاری کے نام ہی سے بلاتے۔

اپنی عمر کے اعتبار سے پنج ہزاری ایک طویل مدت سے لوگوں کو جیتے مرتے، ہنستے روتے، خُوش اور اُداس ہوتے دیکھتا رہا تھا۔

صرف اُسی بستی کے باسی ہی نہیں بَل کہ دُور دراز کے لوگ بھی اُس کی زیارت کے لیے آتے۔ اُس کے سائے تلے بیٹھ کر سُکھ کا سانس لیتے۔ اُس کی داڑھی کو اپنے ہاتھوں سے چُھو کر مسرت پاتے۔ اُس کے نیچے بیٹھ کر دُعائیں اور منّتیں مانگتے، اُسے اپنا دُکھ سُکھ بانٹتے اور اپنا احوال سناتے۔ لیکن کسی کو پتا نہیں تھا کہ وہ اُن کی سنتا بھی ہے یا نہیں کیوں کہ وہ ہمیشہ چُپ چاپ کھڑا رہتا تھا البتہ اُنھیں یقین تھا کہ وہ اُن کی سنتا اور دُعا بھی دیتا ہے۔ پس، وہاں لوگ مایوس آتے لیکن اپنے دِل کا بوجھ اُتار کر گھروں کو مسرور لوٹتے تھے۔

......❖......

اگلے دو روز میں گھٹا کافی حد تک کم ہوگئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ آج کی رات یا ایک آدھ روز میں وہ چھٹ جائے گی۔ اگر ساری نہ بھی چھٹی تو اِتنی ضرور کم ہو جائے گی کہ کچھ ستارے دِکھائی دے جائیں گے اور کسی حد تک سُورج بھی نکل آئے گا۔ شام ڈھلنے کے بعد بستی کے ہر فرد کی نگاہیں ستارے دیکھنے کے آس لیے آسمان کو تک رہی تھیں۔

بستی کا ایک بزرگ دھاگا تھام کر بیٹھا ہُوا کچھ پڑھ پڑھ کر دھاگے کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے توڑ رہا تھا۔ سب بے خبر تھے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے مگر لوگوں کی اُمید بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ آج گھٹا ختم ہو جائے گی۔

ابھی لوگ یہ سب کر ہی رہے تھے کہ یکا یک بجلی کڑکی۔ بادلوں کی گرج اِس قدر دہشت ناک تھی کہ بچّے خوف زدہ ہو کر چار پائیوں کے نیچے گھس کر چیخنے چلّانے لگے۔ جوان اور بُوڑھے بہ آوازِ بلند وِرد کرتے کرتے رونے لگے۔ گرج کے ساتھ ہی اُن کے دِل بیٹھتے اور لگتا جیسے وہ سانس لینا بُھول گئے ہوں۔ بادل تو پہلے بھی بہت گرجتے رہے تھے لیکن وہ گرج...... بُوڑھوں کا کہنا تھا کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ سنی ہے۔

کیا کہیں بجلی گری ہے؟ وہ ایک دوسرے پوچھ ہی رہے تھے کہ بارش کے قطرے گرنے لگے۔

اگرچہ بوندیں تھوڑی دیر ہی پڑی تھیں۔ لیکن کوئی ڈر تھا جو لوگوں کی سانسیں سکھا رہا تھا۔

......❖......

کئی روز سے اُسے خواب میں وہ پیڑ دِکھائی دے رہا تھا۔ وہ خواب کم دیکھتا اور اُن پر کوئی دھیان نہیں دیتا تھا۔ لیکن اِس جیسے خواب کبھی کسی کو دِکھائی نہیں دیے تھے۔

پہلی رات اُسے یُوں لگا جیسے وہ پیڑ کے ساتھ رَسّی باندھ کر اُس پر جھولے لے رہا ہے۔ یہ خواب اُس نے ایک ہی رات میں دو مرتبہ دیکھا۔

صبح کے وقت جب اُٹھا تو اُس نے خواب پر کوئی توجہ نہیں دی۔ باقی خوابوں کے مانند یہ خواب بھی اُسے بُھول جاتا اگر اگلی رات پھر اُسے پیڑ کا خواب دِکھائی نہ دیتا۔

دُوسری رات اُس نے دیکھا کہ وہ درخت اُسے اُس کا نام لے کر پُکار رہا ہے۔ وہ پیڑ تک پہنچا ہی تھا کہ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن نیند تو جیسے خواب کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کب اُس کی آنکھ لگی لیکن اُسے کوئی خواب نظر نہ آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ پیڑ اُسے اپنا وعدہ یاد دِلا رہا ہے۔

چوتھی شب کے خواب نے تو اُس کے ایسے پسینے چھڑائے کہ اُس نے خوف کے مارے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں کہ ذرا سی بھی جھپکی آئی تو خواب اُسے اپنے ساتھ اُٹھا کر ہی نہ چل دے۔

اُس نے سوچا کہ وہ اپنا وعدہ نبھا تو رہا ہے مگر شاید پُوری طرح نہ نبھا رہا ہو یا اُس میں کوئی کمی رہ گئی ہو۔ اُس نے یہ خواب دیکھا کہ رَسّی جیسی ایک لچک دار شاخ اُس کی گردن کے گرد لپٹ گئی ہے جس سے اُس کا سانس گھٹ گیا ہے اور اُس کی آنکھیں اُبل کر اپنی حلقوں سے باہر نکل آئی ہیں۔ دہشت سے اُس کی نیند اُچاٹ ہو گئی لیکن وہ اپنی آنکھیں کھولنے سے ڈرتا اور اُس کا سانس دھونکنی کی طرح چلتا رہا۔

......❖......

جس طرح وہاں کے باسی پنج ہزاری کو صرف اپنی بستی ہی نہیں بَل کہ سارے علاقے کے لیے باعثِ رحمت سمجھتے تھے وہیں کئی لوگوں کا یہ بھی ماننا تھا کہ بستی کا قائم و دائم ہونا اُسی کے سبب سے ہے اور وہ جمعرات کے جمعرات دِیے روشن کرتے تھے۔

لیکن وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اِس کے منکر تھے اور دِیے روشن کرنے والوں کو اچھا نہیں گردانتے تھے۔ وہ وہاں کے اصل باشندے نہیں بَل کہ وہ لوگ تھے جنھوں نے پردیس سے آکر دہاں بُود و باش اختیار کر لی تھی۔ اصل باسیوں کو اُن کی یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی کہ وہ پنج ہزاری کو نہ صرف باعثِ رحمت نہیں سمجھتے تھے بَل کہ ایسی باتیں بھی کرتے تھے جو اُن کے دِل میں خار کے مانند چبھتی تھیں۔ بعض اوقات وہ محض اِسی ایک بات کی وجہ سے آپس میں بھڑ بھی پڑتے لیکن بستی کے بُڈّھیرے معاملے کو رفع دفع کروا دیتے۔ یہ مسئلہ آج کا نہیں تھا۔ یہ صدیوں کا ٹنٹا تھا کہ لوگ پنج ہزاری کو ہی بستی کا اصل باشندہ سمجھتے تھے۔

غیر باشندوں کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ لوگ تو وہاں کے باسی ہیں لیکن ایک درخت کیسے وہاں کا باسی ہو سکتا ہے؟ اِس کے جواب میں وہاں کے اصل باشندے موقف اختیار

کرتے کہ جو جہاں جنم لے وہ وہیں کا ہوتا ہے۔ وہ غیر باشندوں کو صاف صاف کہتے تھے کہ تمھارا ہمارا آپس میں کوئی قضیہ نہیں کیوں کہ تم میں سے جو لوگ یہاں کا جم پل ہیں وہ یہیں کے ہیں لیکن اگر تم یہ کہو کہ جنھوں نے دھاوے کے ساتھ مدت پہلے یہاں غاصبانہ قبضہ کیا تھا اور وہ یہاں کے لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے، وہ سچے تھے تو یہ بات کاملاً جھوٹ ہے۔ یہ جھگڑا اُس وقت زیادہ شدّت اختیار کر جاتا جب غیر باشندے پنج ہزاری کے متعلق اِس قسم کی باتیں کرتے: ''وہ محض ایک پیڑ ہے۔ بس۔ اُس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اصل باشندے اُسے خواہ مخواہ اپنے ساتھ جوڑ کر اپنے آپ کو نیچ کر لیتے ہیں۔''

......❖......
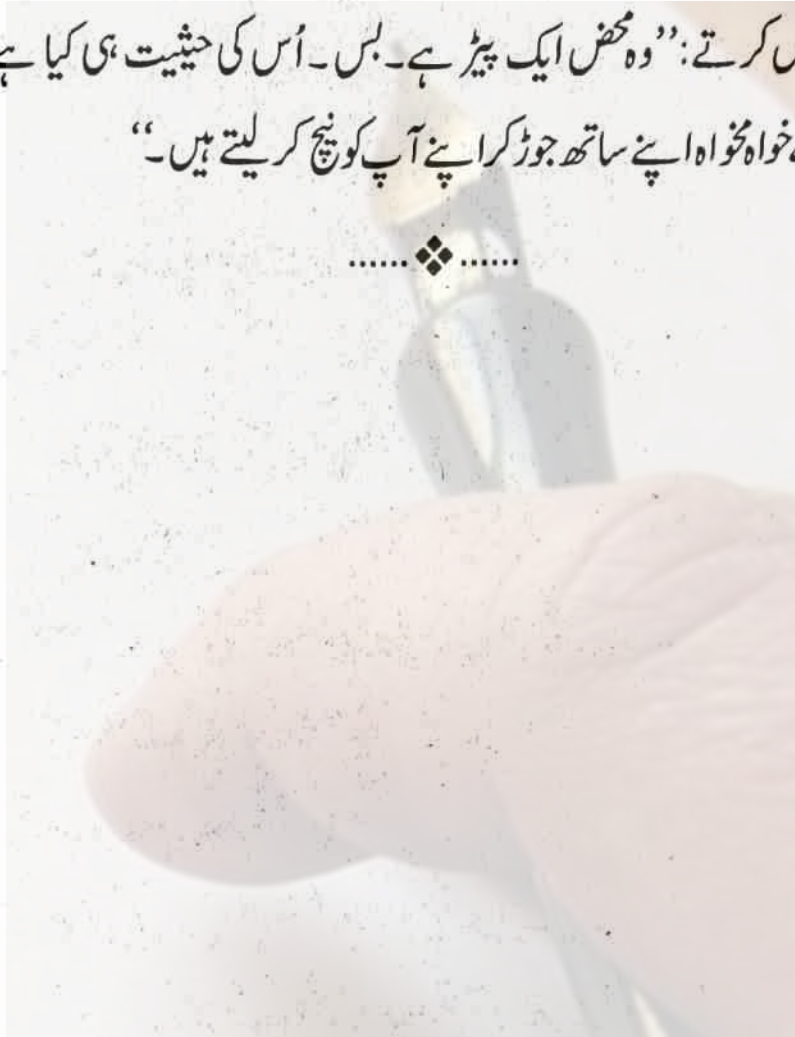
''تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں؟''

''نہیں۔''

''میں تم پر اعتبار کر سکتا ہوں؟''

''کیوں؟''

''میں نے وہم کی آنکھ دیکھی ہے، جہاں اعتبار نہیں ہوتا۔''

''تو اعتبار کہاں ہوتا ہے؟''

''جہاں وہم نہ ہو!''

''میرا خیال ہے کہ تم وہم کی پرچھائیں کی ایک پرت ہو۔''

''تمھارے سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم تو ہر چیز ہی اُلٹی اور آدھی آنکھ سے دیکھتے ہو۔''

''لیکن میں نے تمھیں سالم آنکھ سے دیکھا ہے۔''

''پھر بھی تم اعتبار نہیں کرتے؟''

''مجھے تم پر اعتبار ہو سکتا ہے مگر......!''

''مگر کیا؟''

''تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ آج سُورج وقت سے پہلے کیسے طلوع ہو گیا؟''

''یار، تم کیسی افسانوی باتیں کرر ہے ہو؟ کبھی سُورج بھی وقت سے پہلے طلوع ہُوا ہے؟''

''ہاں، ہُوا ہے۔''

''لیکن سب کے لیے نہیں۔''

''سُورج سب کے لیے ہوتا ہے۔''

''ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔''

''ایک مرتبہ تو سُورج نکلا ہی نہیں تھا!''

...... ❖ ......

''میں وہ دِیا ہُوں جو ایک طویل عرصے سے روشن ہے۔ گو مجھ پر صدیوں کی دھول جمی ہے لیکن میں پھر بھی روشن ہوں۔ اگر چہ میری روشنی ماند پڑ گئی ہے لیکن بجھا تو نہیں۔'' یہ لکھتے ہی وہ بے چین ہو کر بائیں ہاتھ سے اپنی کمر کھجانے لگا۔ جُوں ہی اُس کا ہاتھ کمر پر پہنچا اُس کی اُنگلیاں سِکّے جتنے بڑے ایک دائرے سے ٹکرائیں۔ یہ تو کوئی نشان لگتا ہے۔ کسی چیز نے کاٹا ہوگا۔ وہ اپنی اُنگلیاں اُس نشان پر پھیر پھیر کر اندازہ کرنا چاہ رہا تھا کہ آخر ایسی کون سے چیز وہاں کاٹ گئی ہے جس سے وہ نشان بنا ہے۔ جُوں جُوں اُنگلیاں پھرتی رہیں تُوں تُوں وہ قیاس لگاتا رہا۔

کوئی پھوڑا تو نہیں نکل آیا؟ پھوڑا تو نہیں لگتا۔ یُوں لگتا ہے جیسے یہ کافی پُرانا ہو۔ لیکن درد نہیں ہے۔ پُرانا ہو گیا ہے اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن...... یہ سوچتے ہُوئے اُس نے آنکھیں موند لیں۔

اُس کے گلے میں پٹّا پڑا ہُوا ہے اور کسی نے اُسے کھونٹے سے باندھ دیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسی آدمی کے ہاتھ میں دہکتی ہُوئی لال انگارہ سلاخ ہے جس کے اگلے

ہرے پر ایک گول مہر بنی ہُوئی ہے، وہ آتے ہی سلاخ اُس کی پشت پر اِتنے زور سے کھبوتا ہے کہ چیخ کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہنے لگتے ہیں۔

''ٹھپہ! غلامی کا......ٹھپہ!''

''میں......تمھارا......غ......ل......ا......م......ن......)

وہ نیچے گر پڑا۔ ٹیسیں اُس کے وجود سے نکل کر کھونٹے سے بندھی ہُوئی ہیں۔

......❖......
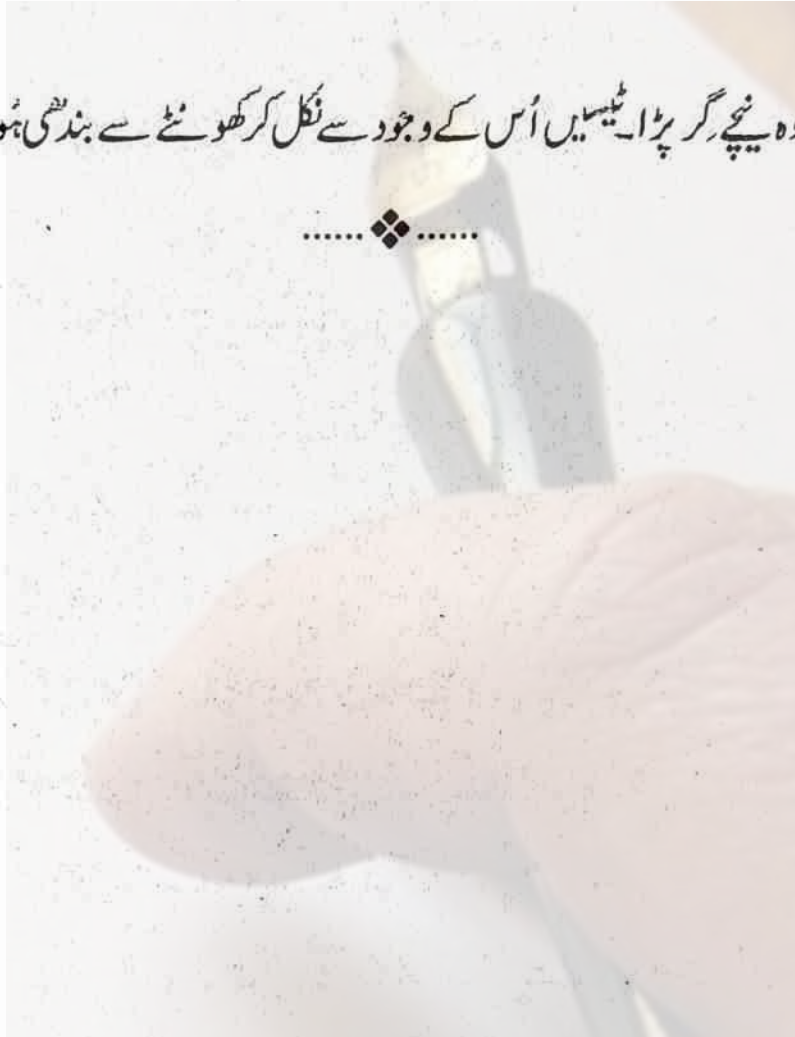
”کشت وخُون ہو رہا ہے۔“

”دُکھ کا؟“

”نہیں یار......۔“

”پھر سُکھ کا ہو رہا ہوگا۔“

”کبھی دُکھ یا سُکھ کا کشت وخُون سنا ہے؟“

”تم سننے کی بات کر رہے ہو؟ میں نے دیکھا بھی ہے۔“

”تم کون سا کشت وخُون دیکھا ہے؟“

”میں سُکھ کو قتل ہوتے دیکھتا آ رہا ہوں۔ اب مجھے اِس طرح لگ رہا ہے جیسے کہیں دُکھ کا کشت وخُون بھی شروع ہو گیا ہے۔ خیر، یہ تو اچھی بات ہے کہ نہ دُکھ زندہ بچے گا اور نہ سُکھ۔“

”پھر؟“

”پھر کیا؟“

''ہم ہر دُکھ سُکھ سے محروم ہو جائیں گے۔ اِس جہان میں دُکھ اور سُکھ آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو زندگی کا لطف جاتا رہے۔ لوگ جینا چھوڑ دیں۔''

''واہ بھئی واہ، زندگی کا لطف بس دُکھ سُکھ سے بندھا ہُوا ہے۔''

''اگر دُکھ اور سُکھ دونوں کا خاتمہ ہو جائے تو؟''

''زندگی تلاش کا نام ہے۔ اپنی تلاش اور اپنی شناخت!''

''شناخت بھی تو ایک دُکھ ہے۔''

''تمھیں لگتا ہو گا۔ لیکن تمھیں یہ بات سمجھ نہیں آسکتی کہ شناخت دُکھ اور سُکھ سے آگے کی بات ہے۔''

''کشت و خُون ہو رہا ہے تو لال آندھیاں چلنا کیوں بند ہو گئیں۔''

''بند نہیں ہُوئیں، بس ہم دیکھنے کے اہل نہیں رہے۔''

''آندھیاں نہیں چلتیں؟''

''یہ تمھاری سوچ ہے۔''

''گرہن لگنا بھی تو کم ہو گئے ہیں۔''

''نہیں، ہر چیز کو گرہن لگا ہُوا ہے۔ ہماری سوچوں تک کو!''

''لگتا ہے اب مصیبت میں پھنس گئے۔''

''پہلے کم پھنسے ہُوئے ہیں۔''

''ہر سچ مصیبت میں پھنسا ہُوا ہے۔''

......❖......

گرتی ہُوئی ریت اور بُھرتی ہُوئی دِیواریں اُس کی اُداسی بڑھا دیتی ہیں۔ بچپن میں ایک مرتبہ اُس نے بُھرتی ہُوئی ایک کچی دِیوار دیکھی تھی۔ تب اُسے لگا تھا جیسے وہ خُود بھی ایک بُھرتی ہُوئی دِیوار ہے جس کی بنیادیں بھی بُھر جائیں گی اور اُس کی جگہ مٹّی پڑی ہوگی۔ جب بھی اُس کا خیال اِس بات کی جانب جاتا وہ سر جھٹک کر اُسے پرے پھینکتا۔ لیکن گرتی ہُوئی ریت کے ساتھ تو اُس کا دُور پرے کا بھی کوئی واسطہ نہیں تھا، پھر وہ اُسے کیوں افسردہ کر رہی تھی؟ اُس کا گمان تھا کہ اُس کے کسی جدِّ امجد کا شعور اُس کے لاشعور سے ہوتا ہُوا اُس کے شعور سے آکر جڑ جاتا تھا۔ اِس بات کو وہ اجتماعی لاشعور کا حِصّہ سمجھتے ہُوئے جھٹک دیتا تھا۔ شاید یہ کوئی وراثتی معاملہ ہو۔ بہرحال، اُسے یہ اپنا مسئلہ بالکل نہیں لگتا تھا۔

وہ گرتی ہُوئی ریت کے پہاڑ میں پھنسا ہُوا ہے اور صرف اُس کی گردن دِکھائی دے رہی ہے۔ ہَوا کے ساتھ اُڑ اُڑ کر ریت اُس کے مُنھ پر گر رہی ہے۔ اُسے چہار سُو ریت ہی ریت نظر آ رہی ہے اور اُسے لگ رہا ہے جیسے ریت کے ٹیلے بنتے بگڑتے جا رہے ہیں۔ اُس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں اور رَیت اُس کے سر تک پہنچ گئی ہے۔

ریت گر رہی ہے اور بس اُس کے بالوں کی لٹیں دِکھائی دے رہی ہیں۔

......❖......

لگتا ہے جیسے آج بستی پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے۔ یہ بات ایک بڈّھے نے لوگوں کے مُنھوں کو دیکھ کر کہی۔ اُس کے پاس علمِ نجوم تھا یا پھر اُس نے محض قیاس لگایا تھا کیوں کہ اُس بڈّھے کو صبح سویرے ہی سے یہ لگ رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اُس نے نے سب سے پہلے اپنی بیوی سے کہا۔ ''مجھے بستی والوں کے چہروں پر ملال کی سی ایک کیفیت نظر آ رہی ہے جیسے کچھ ہونے والا ہو۔'' لیکن کیا؟ اِس سوال کا جواب اُس کی عمر بھر کا تجربہ بھی دینے سے قاصر تھا۔ بس ایک عجب سی بے کسی سے بھری اُداسی اور بے قراری تھی جو اُسے اپنے اندر سے اُٹھتی ہُوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''پتا نہیں کیا ہو جائے!'' اُس نے زور دے کر کہا۔

''تمھیں وہموں نے گھیر رکھا ہے۔ مجھے ایسا کچھ دِکھائی نہیں دے رہا۔ بھلے کی دُعائیں مانگا کرو۔ ایسی اُلٹی اُلٹی باتیں سوچ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالو نہ ہمیں۔'' اُس کی بیوی بولی۔

''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ مجھے ہی کوئی وہم کھائے جا رہا ہے۔'' بڈّھے نے جواب دیا۔

لیکن اُس کا دِل گھر میں نہ لگا اور وہ باہر نکل گیا۔ راستے میں اُسے اپنے دو سنگی ملے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اُن کے ساتھ بات کرے یا نہ کرے، پھر یہ سوچ کر کہ آخر بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے، اپنے ایک ساتھی سے بولا۔ ''یار، یُوں لگتا ہے جیسے کوئی آفت آنے والی ہے۔''

''کیسی آفت، یار؟ خیر تو ہے؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' بات سنتے ہی اُس کا دُوسرا ساتھی بول اُٹھا۔

''خدا خیر کرے، یار۔ مجھے یُوں ہی کوئی وہم ہو گیا ہے۔''

''کیسا وہم؟'' پہلا سنگی بولا جس سے اُس نے بات کا آغاز کی تھا۔

''آج کی شام بھاری لگتی ہے، کچھ ہو گا ضرور۔'' بڈّھے نے کہا۔

''تم نے اپنے سارے وہم اِس بستی ہی پر آزمانے ہیں؟ کچھ نہیں ہو گا، نہ تمھیں اور نہ ہمیں۔ تم رات کو سوئے نہیں ہو گے، اِسی لیے بُرا بُرا سُوجھ رہا ہے۔'' پہلے ساتھی نے اُس کے مُنھ کو دیکھتے ہُوئے تبصرہ کیا۔

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ وہاں سے گذرتے ہُوئے ایک جوان نے یہ سن کر بڈّھے سے کہا۔ ''چاچا، اب تم بڈّھے ہو گئے ہو، گھر میں رہا کرو، باہر نہ نکلا کرو؛ ہم بستی کو خود سنبھال لیں گے؛ اب بستی والے پہلے سے زیادہ ہوشیار ہو گئے ہیں؛ ساری رات ہتھیار بند پہرا دیا جاتا ہے۔ تم بے فکر رہو۔''

بستی والوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ کسی بھی ناگہانی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ رات کے وقت بستی کے صحت مند نوجوان ساری بستی کا پہرا دیں تاکہ مصیبت کے وارد ہونے سے پہلے ہی اُس کا پتا چل جائے اور وہ سب مل کر بستی کی حفاظت کر سکیں۔

...... ❖ ......

بظاہر یہی لگتا تھا کہ بستی میں اِس کے سِوا کوئی فرق نہیں پڑا کہ لوگ باہر سے آ کر وہاں بسنے لگے تھے۔ لیکن وہاں کے بزرگوں نے اِس امر کو خاص طور پر محسوس کیا کہ اُن کی زبان وہ نہیں رہی جو تھی اور نہ ہی اُن کے رسوم ورواج پہلے والے رہ گئے تھے جو خالصتاً اُن کے اپنے تھے۔ رہن سہن، عادات، کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا تو بدلا سو بدلا بھیس تک بدل گئے تھے۔ بَل کہ اب تو نسلیں بھی خالص نہیں بچی تھیں۔ بزرگ یہ غم اپنے ساتھ لیے پھرتے تھے۔ نہ بول چال وہ رہی تھی اور نہ رسوم ورواج۔ یہ کہیے کہ کچھ نہیں بچا تھا، سب کچھ بدل گیا تھا۔

پنج ہزاری یہ سب دیکھنے کے بعد بھی ویسے ہی کھڑا تھا؛ پُرانے باشندے اب بھی اُس کا احترام کرتے تھے جب کہ نو آباد کار اُسے ایک قدیم پیڑ سے زیادہ نہیں گردانتے تھے۔

...... ❖ ......

گھٹاجوں کی توں موجود ہے۔ بس کبھی کبھار ایک آدھ بُوند کا گمان ہوتا ہے لیکن جبس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اُس کے بھرے ہُوئے پیٹ میں سے اُمس کی گرم ہَواڑیں نکل رہی تھیں۔ اُس کی نگاہیں دِکھائی دینے والے پیروں پر ٹکی ہُوئی تھیں۔

وہ دِھیرے دِھیرے آتا ہے، ایک اَور ڈھیر اُس کے شکم میں رکھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا جاتا ہے۔

اِس جبس میں اِسے یہی کام رہ گیا ہے، پسینے سے شرابور ہے لیکن پھر بھی ڈھیر اُس کی اور میری جان نہیں چھوڑ رہا۔

وہ پسینے میں نہایا ہُوا ہے لیکن پھر بھی اُس کے دماغ میں خیالات کے وجود ایک دُوسرے میں گھل مل کر نئے نئے رُوپ دھار کر کاغذ پر اُترتے چلے جا رہے ہیں۔

''کوئی مجھے کتنا ہی کیوں نہ ڈرائے میں لکھ کر ہی رہوں گا۔'' اُس نے دو اوراق لکھنے کے بعد خود کلامی کی۔

''تمھارے لکھنے سے کوئی فرق پڑے گا؟''

''کسی اَور کو پڑے یا نہ پڑے میری آنے والی نسلوں کو ضرور پڑے گا۔''

''تیری آنے والی نسلوں کو بھی نہیں پڑے گا۔ وہ بھی نامُراد ہی رہیں گی۔''

''نہیں، یہ مت کہو۔ میری آنے والی نسلیں نامُراد نہیں، بامُراد ہوں گی۔''

''اور پچھلی نسلیں؟''

''وہ بھی بامُراد تھیں۔ ہمیں بے مُراد بتایا جاتا ہے۔''

''دھرتی اور نسل کبھی بے مُراد نہیں ہوتیں۔''

ابھی وہ لکھ ہی رہا تھا کہ اُس کے قلم کی روشنائی ختم ہو گئی۔

......❖......

نویں جمعرات ہوگئی ہے لیکن گھٹا رَتّی برابر بھی نہیں گھٹی تھی۔ اگر چہ مینھ تو نہیں برساتھا لیکن لوگوں کے دِل میں ڈر بیٹھا ہُوا تھا کہ برس پڑا تو کیا ہوگا؟

''کوئی جادو ٹونا کریں؟''

''کرنا ہی پڑے گا ورنہ گھٹا بڑھتی جائے گی، اگر مینھ برسنے لگا تو کیا ہوگا؟''

''فصلیں برباد ہو جائیں گی، اَور کیا ہوگا؟''

''پہلے بھی تو فصل اچھی نہیں ہُوئی۔''

''جو ہُوئی ہے اُسے تو دیکھ ہی لیں۔''

''تمھیں عمل یاد ہیں؟''

''نہیں، مجھے تو کسی عمل کا نہیں پتا کہ یہ کیا ہوتا ہے؟''

''تو کسی ایسے شخص کو تلاش کرو جو عامل کامل ہو۔''

''لگتا ہے لوگ اپنے آپ کو بھولتے جا رہے ہیں۔''

''کیسے؟''

''عمل بھی کوئی بھولنے کی چیز ہے۔''

''آج کل اُسے کوئی یاد نہیں کرتا۔''

''ہم ہر چیز بھولتے جارہے ہیں۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں، ہمیں کسی نے سکھایا ہی نہیں تو یاد کیسے ہو؟''

''اِسے خُود سیکھنا پڑتا ہے۔''

''کوئی سکھاتا تو سیکھتے۔''

''یہاں کوئی کسی کو کچھ نہیں سکھاتا، ہر شخص خُود ہی سیکھتا ہے۔''

''گھٹا کا سوچ، گھٹا کا۔''

''میں عمل کو روتا ہوں، تم جھڑی کو روؤ۔''

''اگر عمل یاد نہیں تو گھٹا یوُں ہی رہے گی۔''

''لعنت ہے تم پر!''

......❖......

چھاؤں سکڑتی جارہی تھی۔ یہ اُس کا خیال تھا۔ وہ کئی روز سے اِس وہم کا شکار تھا، یا پھر واقعی سائے چھوٹے پڑتے جا رہے تھے۔ یہ دونوں باتیں سوچ کر کبھی وہ حیران تو کبھی فکرمند ہو جاتا۔ چلتے پھرتے ہُوئے اُسے لگتا تھا کہ اُس کے سامنے یا دائیں بائیں جہاں پہلے اچھی خاصی چھاؤں ہوتی تھی، اب ویسی دِکھائی نہیں دیتی تھی اور جب وہ دُھوپ میں چلتا تو اُسے یہ بھی لگتا کہ اُس کا سایہ پہلے سے بہت چھوٹا ہو گیا ہے جو اُس کے پیچھے یا سامنے چلنے کے بجائے اُس کے بازو پر چلتا ہے۔ اُس نے اپنا بازو اُوپر نیچے حرکت دے کر دیکھا لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔ بل کہ اُوپر اُٹھانے سے یُوں لگتا جیسے سایہ اُس کے کھوپڑی جتنا رہ گیا ہو۔ اُس نے سر ہلا کر بھی دیکھا اور کھڑا ہو کر بھی لیکن سایہ رَتّی برابر گھٹا نہ بڑھا۔

ہمارے سائے چھوٹے پڑتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ صُورتِ برقرار رہی تو یہ بہت سکڑ جائیں گے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کاملاً ختم ہو جائیں۔ سایوں کے ختم ہونے کا سوچ کر وہ تھرا اُٹھا کہ واقعی یہ سچ نہ ہو جائے لیکن اُس نے اپنے آپ کو دلاسا دیا کہ سائے کبھی ختم نہیں ہوتے اور نہ ہی اُس نے کبھی سایوں کے ختم ہونے کے بارے میں کوئی بات سنی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ وہ چھوٹے پڑ جائیں لیکن ختم نہیں ہوتے۔ ویسے بھی اِس سے کیا ہو گا؟ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، سایہ ضرور ہونا چاہیے۔

''یہ پیڑ جو اِتنا پُرانا ہے، اِس نے تو زمانے کی ہر چیز دیکھی ہوگی۔''

''لیکن یہ بول نہیں سکتا۔''

''تم بھی تو دیکھ رہے ہو۔ تم ہی کچھ بتادو۔''

''میں جو بھی دیکھتا ہوں، بُھول جاتا ہوں۔''

''تم بُھولتے نہیں ہو! بس بتانا نہیں چاہتے۔''

''نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے کوئی بات یاد نہیں رہتی۔''

''ویسے بھی میں پیڑ کے اندر رہوں۔''

''چلو، پیڑ کے بارے میں ہی کوئی بات بتادو۔''

''پیڑ کے بارے میں بات؟'' وہ لحظہ بھر خاموش رہا پھر بولا۔ ''پیڑ کی بات تو پیڑ ہی بتا سکتا ہے۔ میں نہیں بتا سکتا۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں۔''

''کیسے؟''

''مجھے، اَور کیسے؟''

''میں سمجھا تھا تم پیڑ کے بارے میں کہہ رہے ہو۔''

''میں درخت نہیں ہوں، میں کیا کہوں؟''

''تم درخت کا حِصّہ تو ہو سکتے ہو۔''

''نہیں، نہیں۔ میں پیڑ کا حِصّہ......۔''

''یا درخت تمھارا حِصّہ......؟''

''پیڑ بھی تو ہر بات بُھول سکتا ہے۔''

یہ ایک ایسا خیال تھا جس نے اُس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا کہ پیڑ سب کچھ بُھول ہی نہ بیٹھے؟

......❖......

رات کے وقت بستی میں پہرا دیا جاتا اور لوگ ہتھیار بند ہو کر چلتے اور وقفے وقفے سے زمین پر ایک آدھ بار چوٹ لگا کر زوردار ٹھک ٹھک کی آواز بھی پیدا کرتے رہتے تھے۔

اُس بستی کے باسی ایک دُوسرے کے دُکھ سُکھ کے ساجھی تھے لیکن کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی پُوچھ کر نہیں آتی، جب بھی آتی ہے اچانک ہی سر پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اور آج کی شب کے پہلے پہر بھی یہی کچھ ہُوا۔

جوان پہرہ دے رہے تھے کہ اُنھیں دُور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ آوازیں سنتے ہی اُنھوں نے بستی کے تمام لوگوں کو پُکار کر خبردار کیا: تیار ہو جاؤ۔ کہیں سے حملہ آوروں نے بستی کی طرف مُنھ کر لیا ہے۔

بس تو پھر کیا تھا۔ بستی والوں نے اپنے نیزے، تلواریں اور بھالے اپنے اپنے ہاتھوں میں کر کے آنے والوں کی آوازوں پر کان لگا دیے۔

دھاوا بولنے والوں کی اُس بستی پر یہ دُوسری مرتبہ جارحیت تھی۔ وہاں پہنچ کر اُنھوں نے اپنی بولی میں کچھ کہا لیکن وہ زبان کسی کو نہیں آتی تھی۔ دھاوا بولنے والے لوگوں

کے دروازوں پر نیزے مارنے لگے تو سب سے پہلے پہرے داروں نے اپنی تلواریں نکالیں اور گھمسان کا رَن پڑ گیا۔ جارِح گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے ایک انوکھا اور نیا ہتھیار استعمال کر رہے تھے اور بستی والے گھروں میں ہی سے نیزوں سے تاک تاک کر نشانے لگا رہے تھے۔ جب کہ حملہ آوروں کے پاس چوبی دستے والا ایک نیا ہتھیار تھا جس کے آگے ایک یا دو نالیاں جڑی ہُوئی تھیں۔ اُنگلی کے اشارے سے وہ ہتھیار سے کوئی ایسی چیز پھینکتے تھے جو دھماکے کی آواز کے ساتھ جسے لگتی اُس کے سینے سے خُون کی دھار بہنے لگتی۔

وہ ایک ایسی لڑائی تھی جس میں لوگ بڑھ چڑھ کر مرنے اور مارنے پر تُلے ہُوئے تھے؛ جس میں بستی کے زیادہ افراد مارے گئے اور بہت کم جارِح جہنم واصل ہُوئے۔

وہ جنگ زیادہ دیر نہ چلی لیکن اُس کے بعد ہونے والی جنگیں طویل عرصے تک چلتی رہیں۔

نسلیں ہی نہیں سب کچھ دوغلا تر غلا ہو گیا۔

......❖......

کچھ بُوندیں پڑنے کے بعد لوگوں کا خیال تھا کہ اب گھٹا ختم ہو جائے گی لیکن بادل جُوں کے تُوں چھائے رہے۔ بادل ایک بار پھر اکٹھے ہونے لگے۔ رات پڑنے تک گھٹا بڑھ کر پہلے سے زیادہ گھنگھور ہو گئی۔

اِس بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے اور اب تو اپنے اپنے خداؤں سے گلے شکوے کرنے لگے تھے۔ کچھ کہتے تھے کہ چار چھے بُوندوں کا کیا فائدہ، ایک بار ہی برس پڑتا۔ گھٹا سے تو جان چُھوٹتی۔ کچھ یہ کہہ رہے تھے کہ شکر ہے، بُوندیں ہی پڑیں مینھ نہ برسا۔

گھٹا کے خوف سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا۔ لوگ دہشت زدہ ہو گئے تھے اور ڈر سے اُن کے مُنھ زرد پڑے ہُوئے تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے بستی کے تمام لوگوں کے مُنھوں پر کسی نے ہلدی مَل دی ہو۔

وہ اُس گھٹا کے اُمس سے اِس قدر تنگ آ گئے کہ اُن کی قوّتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ ایک دُوسرے سے بات بے بات جھگڑنے لگے۔

ایک کہتا۔ ''مینھ برس جاتا تو اندر سے ڈر بھی نکل جاتا۔''

دُوسرا بولتا۔ ''اگر برس پڑتا تو اندر سے ڈر نہ نکلتا جان نکل جاتی۔''

''اِس خوف سے تو مرنا ہی بہتر ہے۔'' تیسرا کہتا۔

کوئی اَور لکھ رہا ہے۔ وہ جو لکھنا چاہتا ہے، وہ نہیں لکھا جا رہا۔ لیکن اِس طرح کبھی نہیں ہُوا کہ وہ کوشش کرے اور لکھے کوئی دُوسرا۔ اُس نے لکھنے کے لیے سامنے دھرا ہُوا قلم ابھی اُٹھایا ہی تھا کہ اُس نے دیکھا کہ اُس کے سامنے لکھے ہُوئے ورق پڑے ہیں۔

''یہ نہیں ہوسکتا، یہ نہیں ہوسکتا۔''

کچھ دیر کے لیے اُس کا سانس گُم ہوگیا۔ پھر اُس نے حوصلہ کر کے اپنے سامنے دھرا لکھا ہُوا کاغذ اُٹھایا۔ جُوں جُوں وہ پڑھتا گیا، تُوں تُوں سہمگی بڑھتی چلی گئی۔ ابھی اُس نے ایک ہی ورق پڑھا تھا کہ اُس کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔

جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا ویسے ویسے اُس کے دِل کی دھڑکن تیز ہوتی چلی گئی۔ یہ...... یہ......نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے؟ یہاں کے لوگوں کی روزمرّہ کی زندگی...... کیا میری بھی؟......نہیں...... ہاں......میری بھی۔ لیکن...... کس لیے؟ وہ آج بھی اُس بستی کے پیچھے پڑے ہُوئے ہیں؟ وہ باتیں بھی لکھی ہُوئی تھیں جو لوگوں نے آپس میں کی تھیں۔ مجھے جتایا تو نہیں جا رہا...... میں......روزنامچہ......یہیں کا کیوں؟ یہ باتیں کون لکھ رہا ہے؟ کوئی تو وجہ ہوگی؟......کوئی پُرانی تاریخ تو نہیں پھرول رہا؟ کون پھرول سکتا ہے؟ کون؟ یہاں بھی جاسوس...... جاسوس؟ بستی والوں کو؟ دھاوا......تاریخ......تاریخ......اُس کی...... جنگ کی

تاریخ؟ یا تاریخ کی چڑھائی؟ کوئی پنج ہزاری کو تو......! ہوسکتا ہے......مگر کیوں؟ کیوں کہ......وہ......اُن کا......نہیں......تو کیا غیر باشندے......نہیں......اُن کی مجال ہے...... اصل باشندے بھی تو!......کیا نہیں ہوسکتا؟......لگتا تو نہیں......لیکن......ہو تو سکتا ہے۔ یہ ہمیں شروع ہی سے......اِسی لیے تو پنج ہزاری نے مجھے؟

اُس نے ایک اور کاغذ اُٹھایا۔ اب وہ بغور پڑھ رہا تھا۔ یہ کیا؟......ساری زمین کے باسیوں کے بارے میں......؟ یہ تو......سازش......کس کی......؟

......سوچتے سوچتے اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا......

''میں نے نہیں لکھا۔ یہ کیسے ہو گیا؟ یہ سفید جُھوٹ ہے۔ یہ جُھوٹ لکھا جا رہا ہے۔ یہ میں نے نہیں لکھا......میں نے نہیں لکھا۔''

وہ تمام کاغذ پڑھے بغیر ہی جلد جلد اُٹھا کر ایک ایک کر کے پھاڑنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو لگا تار بہہ رہے تھے۔

''یہ رَو کیوں رہا ہے؟'' وہ اُسے سامنے سے آتا دیکھ کر بولی۔ وہ پھاڑے ہُوئے کاغذ پھینکنے ہی والا تھا کہ اُس کے دِل میں کوئی خیال آیا۔

وہ ماچس تلاش کرنے لگتا ہے۔ اُسے ماچس نہیں ملتی۔ وہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چبانے اور چبا چبا کر اُس کے شِکم میں پھینکنے لگتا ہے۔ اِس کام میں اُسے آدھ گھنٹا لگتا ہے۔ وہ دوبارہ واپس آ کر اپنی کُرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ بیٹھتے ہی اُسے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔

اُس کی اُبکائیاں نہیں تھمتیں اور سامنے پڑے کاغذ سفید جھاگ میں اَٹے ہُوئے ہیں۔

......❖......

کسی بھی آباد شہر یا بستی کو برباد کرنے میں وہاں کے باسیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔کوئی یُوں ہی باہر سے آ کر کسی کی جگہ پر قبضہ نہیں کرسکتا۔غیر باشندے یہ طعنہ اصل باشندوں کو ہر وقت مارتے رہتے تھے۔

''باسیوں کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بے چارے تو بس بے بسی کی موت مرتے ہیں۔''

''ہاں، یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کچھ باسی اپنے وطن کے نہیں اپنی طمع کے ہوتے ہیں اور وہی اُن کے ساتھ ملی بھگت کر لیتے ہیں۔''

''تو وہ باسی تو نہ ہُوئے۔''

''میں نے اُنھیں باسی نہیں کہا۔ وہ بھی غیر ہوتے ہیں۔''

''اِسی لیے زلزلے آتے ہیں، آتش فشاں پھٹتے ہیں۔''

''زلزلے؟''

''اِس کا کیا مطلب ہُوا؟''

''اِس کا سیدھا سادا مطلب ہے کہ زمین اُنھیں قبول نہیں کرتی اور اِس طرح

اپنے غصّے کا اظہار کرتی ہے۔"

"لیکن زلزلے تو اب بھی آتے ہیں، آتش فشاں بھی پھٹتے ہیں۔"

"اب بھی تو دُنیا میں کہیں نہ کہیں یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

"اِس کا سبب یہ نہیں ہے۔"

"تمھیں نہیں لگتا ہوگا۔ میری نظر میں اِس کا یہی سبب ہے۔"

"زمین کانپتی ہے، حضور۔ کانپتی ہے۔ اُسے پتا ہوتا ہے کہ کون سا پیر اُس کے باسی کا ہے اور کون سا غیر باسی کا۔"

"اب تو ساری دُنیا اِک مُلک ہوگئی ہے۔ کسی باشندے یا غیر باشندے کا سوال ہی نہیں رہا۔"

"نہیں، آج بھی یہ سوال اپنی جگہ جُوں کا تُوں موجود ہے۔"

......❖......

''یہ تو گھوڑوں سے چڑھائی کر رہے ہیں۔''

''ہمیشہ گھوڑوں پر ہی نہیں آتے۔'' وہ بولا۔

''بحری جہاز میں بیٹھ کر بھی آتے ہیں۔''

''مدت سے آ رہے ہیں۔''

''لیکن ہم کیا کریں؟''

''تم؟''

''ہاں، ہم۔''

''تم وہ راستہ ہی بند کر دو جہاں سے آتے ہیں۔'' وہ مُسکرایا۔

''تم بھی اُن کے ساتھ مل گئے ہو؟''

''کبھی راستے بھی بند ہُوئے ہیں۔ وہ آسمان سے اُتر آتے ہیں۔''

''وہ راستہ کیسے بند ہوگا؟''

''ہمیں تو مار ڈالتے ہیں۔''

''وہ تو یہ بات نہیں مانتے۔''

''وہ.....نہیں مانتے.....وہ......!''

''ٹھیرو۔وہ کہتے ہیں۔''

''کیا؟''

''ہم نہیں مارتے ،وہ خُود مرتے ہیں۔کیوں ہمارے ہتھیاروں کے سامنے آتے ہیں۔''

''یہ کیابات ہُوئی؟''

''یہی بات ہے۔''

''یہ......یہ......کاٹتے بھی ہم کو ہیں اور......طعنے بھی ہم ہی کو......!!''

......❖......
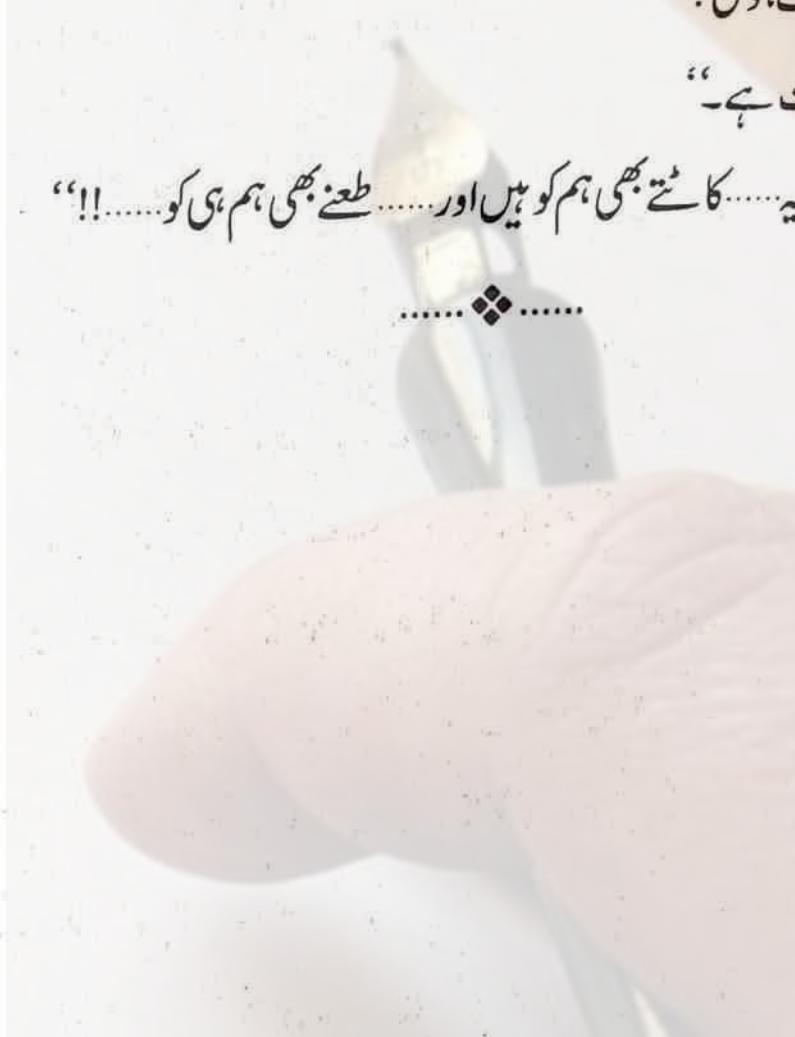
گھٹا اپنی جگہ......

پچھلے چند روز سے دُنیا کے حالات بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ سب ہی اپنے اپنے ہم سایوں پر چڑھائی کرنے کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ سب کچھ ملیامیٹ کر ڈالنے والی جنگ کے چھڑنے کا خطرہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لوگوں کو صرف رات ہی نہیں دِن بھی بھاری لگنے لگے تھے۔ جدھر دیکھو لوگ اِسی موضوع کو زیرِ بحث بنائے ہُوئے تھے۔ اوّلاً گھٹا، ثانیاً بجلی کی کڑک چمک اور اب جنگ لگنے کا دھڑکا دِلوں کو دہلا رہا تھا۔ آخر کیا ہونے ولا تھا کہ لوگوں کا کھانا پینا تک چُھوٹ گیا۔

اِس فکر میں نیند کہاں سے آتی لیکن آنکھ کون سا پُوچھ کر لگتی ہے۔ کسی بھی وقت جھپکی آ سکتی ہے۔

لوگ غنودگی کے عالم میں رہنے لگے تھے کہ خبر ملی کسی مقام پر جنگ چھڑ گئی ہے جس کا پھیلاؤ اِتنا وسیع ہے کہ اگلی شب تک دُنیا بھر میں پھیل جائے گی۔ وہ رات اِسی شش و پنج میں بیتی، لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ جنگ کہاں چھڑی ہے...... جنگ کا آغاز کہاں سے ہُوا

ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے لوگ ایک دُوسرے سے مستفسار ہوتے مگر کسی کو خبر نہیں تھی۔

''کسی اَور ہی جگہ لگی ہے۔ یہاں تو امن ہے۔'' یہ بات ایک جوان نے اپنے سنگی سے کہی۔

''یار، جنگ جہاں بھی لگے، ہے تو جنگ ہی۔ پتا نہیں، حملہ آور کیا چاہتے ہیں؟''

یہ بات اُس نے بھی سوچی تھی۔

''یار، اِن حکمرانوں کی شاید مَت ماری گئی ہے کہ تمام ممالک ایک دُوسرے کے دُشمن بن گئے ہیں۔''

''یہ سب طاقت کا کھیل ہے۔''

''طاقت؟''

''ہاں۔''

''تو پھر باسی؟ کون ہیں؟''

''ساری دُنیا ہی غیر باسی ہے۔'' اُس نے گہری بات کی۔

''وہ بڑا ابن کے دُوسرے ملکوں کو آپس میں لڑوا رہا ہے۔''

''یار، آخر اُس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

''طاقت وَر جو ٹھیرا!''

''تب تو سب کچھ وہی کرواتا ہوگا!''

''کرواتا ہوگا نہیں، کروا رہا ہے!''

''تو جو دُوسرے ممالک ہیں اُنھوں نے بھی تو مل کر کوئی ادارہ بنایا ہوگا— غریب ملکوں کے مسائل کے حل کے لیے؟''

''غریب ملکوں کے لیے؟''

''تمھیں سمجھ نہیں آئے گی۔''

''وہ خُود ہی سب کچھ ہیں اور جو اُن کا حکم نہ مانے اُسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔''

''وہ آپس میں کیوں نہیں لڑتے؟''

''طاقت وَر پاگل نہیں ہوتا۔ اُس کی بات اور حکم حتمی ہوتا ہے۔''

''پھر ہم کہاں ہیں؟''

''اُن کی نظر میں تمھارا وجود ہے ہی نہیں۔ اگر ہے تو محض اُن کی غلامی کے لیے۔ ورنہ تمھیں بھی......!''

''کر تو رہے ہیں!''

''جب تک اُسے ضرورت رہے گی، رہو گے۔''

''ہم ضرورت تک ہیں؟''

''ضرورت تک!''

''دیکھا نہیں۔ جس کی ضرورت ہوتی ہے وہ زمین اُس کی بن جاتی ہے۔''

''وہاں کے لوگ؟''

''وہاں کے غلام — غلام!''

''ہم خُود تو نہیں لڑتے!''

''لڑوائے جاتے ہیں!''

''لیکن یہ تو......!''

''یہی ہے۔''

''ہم میں اتفاق ہو جائے تو ہم......؟''

''ہم کون؟''

''شراب دے کر، تمبا کو دے کر، ہمارے آقاؤں کو تحائف دے کر۔ آقاؤں نے ہمیں پکڑوایا، بھرتی کروایا اور جو باقی بچ گئے — وہ ہم ہیں!''

......

''ہم کچھ نہیں ہیں۔ اُنھوں نے سب سے پہلے ہماری انا توڑی۔''

...... ❖ ......

اُس نے اپنے گھر کا تمام سامان بکھیر دیا لیکن وہ اُسے نہ ملی۔ اُسے یاد آرہا تھا کہ اُس نے اُسے بہت سنبھال کر رکھا تھا، لیکن کہاں؟ اِسی چیز کے بارے میں اُس کے دماغ میں کوئی اشارہ نہیں آرہا تھا۔ کہاں رکھا ہوگا؟ وہ دوبارہ دماغ پر زور ڈالنے لگا۔ لگتا تھا جیسے کچھ زیادہ ہی سنبھال کر رکھ دی گئی تھی، اِسی لیے کہیں سے نہیں ملی۔ وہ ایک مرتبہ گھر بھر کی ایک ایک چیز دیکھ چکا تھا: الماریاں، صندوق پر پڑے ٹرنک، ٹرنکوں کے عقبی گودام میں، صندوق کے نیچے، گودام میں بنی ہُوئی کارنسوں پر۔ کوئی جگہ نہیں بچی تھی جہاں اُس نے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی ہو۔ تھک ہار کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن اب بھی اُس کا دھیان اُسی کی طرف تھا۔

وہ اچانک یُوں اُٹھا جیسے اُسے کرنٹ لگا ہو۔ میں نے اُسے اُس صندوق میں رکھا تھا۔ پڑے پڑے اُس کے دماغ میں آیا تو وہ تیزی سے اُٹھا۔

صندوق کی چابی؟ اُس نے ٹرنک کھول کر دیکھا لیکن وہاں چابی نہیں تھی۔ میں اُسے یہیں رکھتا ہوں پھر کہاں گئی؟ آج کا دِن ہی کچھ ایسا منحوس تھا کہ پہلے اُس کا پتا نہیں

چل رہا تھا اور اب چابی خوار کرنے میں لگی ہُوئی ہے۔ اُس کے ذہن میں چابی گھومنے لگی۔ اُس نے گھر کا کوئی کونا چھوڑا نہ کوئی ڈبّا۔ حد یہ کہ چارپائی پر بچھی چادر، تکیوں کے غلاف، غسل خانے میں ٹنگے کپڑے اور گھر بھر میں ٹھونکی ہُوئی تمام میخوں تک پر نظر ڈالی لیکن اگر اُسے یاد ہوتا تو ہی چابی ملتی۔ وہ دِل چھوڑ کر بستر پر گر گیا۔ اُس کا ہاتھ ایک بار پھر سرہانے کے نیچے سرکا لیکن وہاں کیسے ملتی۔

مجھے ہر حال میں اُسے تلاش کرنا ہوگا۔

میں نے اُسے نہایت شوق سے حاصل کیا تھا۔

اُسے دو تین اَور افراد بھی حاصل کرنا چاہتے تھے مگر میں نے اُسے مُنھ مانگے مول کے عوض حاصل کیا تھا، چاہے مجھے اُس کا مول پُورا کرنے کے لیے کسی سے چھین کر ہی حاصل کرنا پڑتا۔ میرے سِوا کسی کو اُس کی قدر کا پتا بھی نہیں تھا۔ وہ کوئی عام شے نہیں تھی...... ایک بڑے دھاوے کی اصلی تصویر...... نایاب اور قیمتی...... اِسی لیے تو حاصل کر کے رہا تھا۔

سمجھ نہیں آ رہی کہ کیسے ڈھونڈوں؟ اُس کا خیال دوبارہ چابی کی طرف چلا گیا۔

بس ایک آخری دراز بچی ہے۔ اگر اُس میں بھی نہ ملی تو؟

...... ❖ ......

”کیا تم نے سنا ہے؟“

”کیا؟“

”پنج ہزاری کو کوئی بیماری لگ گئی ہے۔“

”اُسے کوئی بیماری نہیں لگ سکتی۔“ یہ بات اُس نے اِتنے وثوق سے کہی کہ وہ خُود بھی حیران رہ گیا۔

”کیوں؟“

”وہ تمھاری بیماریوں کو اپنے اُوپر لیے ہُوئے ہے، اُسے بیماری کیا لگے گی۔“

”درخت بیمار نہیں پڑتے؟“

”پڑتے ہیں۔ لیکن یہ پیڑ بیمار نہیں پڑ سکتا۔“ اُس نے ایک بار پھر تیقُّن سے کہا۔

”تمھیں اِس پر اِتنا یقین کیوں ہے؟“

”بس، ہے۔“

”میں نے کئی درخت بیمار پڑتے اور ختم ہوتے دیکھے ہیں۔“

”دیکھے ہوں گے، لیکن یہ اُن میں سے نہیں ہے۔“

”پیڑ تو پیڑ ہوتا ہے۔“

”میں نے تمھیں بتا دیا ہے کہ یہ وہ پیڑ نہیں جو بیمار پڑے اور ختم ہو جائے۔“

......❖......

وہ اپنے کمرے سے نکلا تو اُسے لگا جیسے کوئی اُسے پُکار رہا ہو۔ اُس نے چاروں جانب نظریں گھمائیں مگر اُسے کالی سیاہ گھٹا کی گھور تاریکی کی وجہ سے کچھ دِکھائی نہیں دیا۔

اُس کے دائیں ہاتھ میں ایک گولا تھا جسے وہ توڑ مروڑ رہا تھا۔ پھر اُس نے اُس گولے کو اپنی مُٹّھی میں زور زور سے بھینچ بھینچ کر چھوٹا کیا اور پھینک دیا۔ اُسے دوبارہ پُکارنے کی آواز سنائی دی۔ اُس نے اپنے سامنے والی دِیوار کو دیکھا کہ آواز وہاں سے تو نہیں آ رہی، لیکن دِیوار کیسے بول سکتی ہے؟

''میں دِیوار نہیں، تمھارے ہاتھ میں تھاما ہُوا کاغذ ہوں۔''

قلم اُس کے ہاتھ سے چُھوٹ گیا۔ میں نے کاغذ کا گولا بنا کر باہر پھینکا تھا۔

سامنے والی دِیوار پر چڑھا ہُوا گولا قہقہے لگانے لگا۔

......❖......

''میں نے اپنا گریہ بھی یاد نہیں رکھا۔''

''تم اپنے دُکھڑے رونے لگے، میں زمین کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔''

''میں جب نوزائیدہ تھا تب بھی کسی نے میری نگہداشت نہیں کی۔ میں اب بھی بَین کر رہا ہوں۔''

''تم اپنی بات چھوڑو، میں جو پُوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔''

''میں کوئی اَور بات نہیں کر سکتا۔ میں خُود آہ وزاری کرتا رہا تھا۔''

''تم عجیب آدمی ہو۔ میں تم سے کچھ پُوچھ رہا ہوں، تم بات کو کسی اَور طرف لے جاتے ہو۔''

''میں نے تمھیں بتایا تو ہے کہ میں خُود آہ و بکا کی تھی۔''

''مجھے تمھارے غم سے کوئی مطلب نہیں۔ تم گریہ کرتے یا مسرور رہے۔ میں کوئی اَور بات کر رہا ہوں۔''

''تمھیں یہ کیوں نہیں یاد رہتا کہ میں تو خُود اَلم میں تھا۔''

''پیٹتے رہو۔''

’’تمھیں سمجھ نہیں آ سکتا۔‘‘

’’میں کہتا ہوں تمھیں نہیں آ تا۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’سمجھو، اَور کیا؟‘‘

......❖......
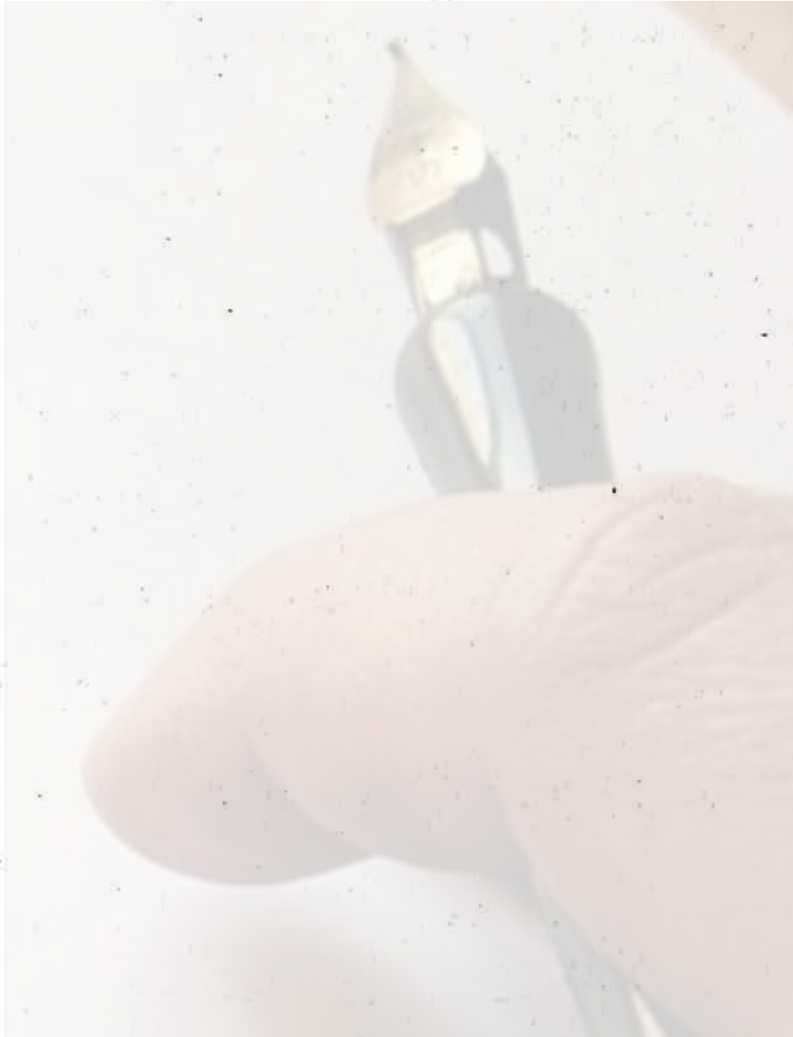
لوگوں نے پہلی بار اِتنے عرصے سے چھائی رہنے والی گھٹا دیکھی تھی۔ وہ خائف تھے کہ وہ گھٹا بڑھ کر زمین کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ اگر دھرتی تک پہنچ گئی تو کیا بنے گا؟

کالے سیاہ بادل ایک دُوسرے میں یُوں گتھے ہُوئے تھے کہ آسمان سے روشنی کی ہلکی سی کِرن بھی زمین تک نہیں پہنچ پا رہی تھی اور حبس تو ایسا تھا کہ بس ربّ کی پناہ ورنہ بچنے کی کوئی صُورت نہیں تھی۔

لوگوں کو زور زور سے سانس لینا پڑتا تھا لیکن پھر بھی اُنھیں سانس کھینچنے میں دُشواری ہوتی جس کا حل کسی کے پاس نہیں تھا۔

کچھ دِنوں سے کچھ لوگ بستر سے بھی لگ گئے تھے اور وہ اپنے گناہوں کی رَو رَو کر معافی مانگ رہے تھے کہ شاید اِسی طرح کہیں سے ہَوا کا کوئی جھونکا آ کر اُن کی سانسیں سہل کر دے۔ لیکن حبس میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ اِس بار اُن کی عبادتیں اور دُعائیں بھی بے اثر ہو گئی ہیں تو وہ طرح طرح کے اوہام کا شکار ہو گئے اور جس کسی نے جو بتایا وہی کچھ کرنے لگے۔

کئی لوگ بچّوں کو گھر گھر خیرات مانگنے کے لیے بھیجنے لگے تو کچھ کا خیال تھا کہ اگر بستی والے کسی بُڈّھے پر گھڑے کا ٹھنڈا ڈالیں تو شاید مینھ برسنے لگے۔ جانوروں کی قربانیاں، کنواری دوشیزاؤں کو بتوں اور دیوی دیوتاؤں کے سامنے قربان کیا گیا اور اُن کے لہو سے دیوی دیوتاؤں کو نہلایا گیا؛ اُس لہو کے چھینٹے آسمان کی سمت اُچھالے گئے جو دوبارہ دھرتی پر ،گر کر تیزاب کے مانند قُلقُل کرنے لگے۔ بیواؤں اور طلاق یافتہ عورتوں کو الف ننگا کر کے درختوں کے تنوں کے ساتھ باندھ کر دیوی دیوتاؤں سے ہاتھ جوڑ کر معافی منگوائی گئی اور جنھوں نے ہاتھ نہ جوڑے اُنھیں بُھوکا پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ مذہبی سرکردہ افراد نے لوگوں سے وہ کچھ کروایا جو وہ نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں یہ سب ہُوا وہیں لوگ سربسجود ہو کر کئی روز دُعائیں اور رحم مانگتے رہے۔

اِن سب کے باوجود گھنگھور سیاہ گھٹاؤں کی تُوں موجود رہی اور اُس نے لوگوں کی کسی بھی دُعا یا قربانی کو قبول نہیں کیا۔ بل کہ لگتا تھا جیسے وہ اُن کے ایسے افعال سے زیادہ غضب کا شکار ہوگئی ہو۔ اِسی لیے آٹھوں پہر بجلی چمکتی اور کڑکتی رہتی جیسے اب ،گری کہ اب۔ اُس کی کڑک یُوں جیسے بڑے بڑے بم پھٹ رہے ہوں۔

گھٹا کی وجہ سے بہت نقصان ہونے لگے۔ گھٹا کے آغاز میں مسافر بردار اور دُوسرے طیارے، ہیلی کاپٹر پرواز کرتے رہے لیکن جب بہت سے مسافر آسمانی بجلی سے جل کر کوئلہ بنے یا جہاز ایک دُوسرے سے ٹکرا کر نیچے ،گرے تو پروازیں بند کر دی گئیں۔ فضائی ماہرین بھی بے بس دِکھائی دے رہے تھے کیوں کہ وہ اپنے پاس موجود انتہائی طاقت دَردُوربینوں سے بھی آپس میں گتھے ہُوئے بادلوں کے اندر نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ اُنھوں نے لاکھوں حربے استعمال کیے لیکن مشینیں کچھ بھی بتانے سے قاصر رہیں۔ کچھ دِکھائی دیتا تو ہی بتاتیں۔

دُھوپ کے عدم سے فصلیں، پھل اور سبزیاں نہ صرف پک نہیں پا رہی تھیں بلکہ اُن کی شکلیں بھی بگڑ گئیں تھیں اور وہ مُڑی تُڑی اور جھرّیلی ہوگئی تھیں۔ گوداموں میں پڑے غلّے کو کیڑے مکوڑے کھا گئے اور اُس کی بدبو لوگوں کے لیے ایک الگ مسئلہ بن گئی تھی۔ قحط کا خطرہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ سب اِسی فکر میں مبتلا تھے کہ اگر اِس کا حل نہ نکلا تو بُھوکے مرتے لوگ ایک دُوسرے کے خُون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ کیوں کہ اب حشرات الارض زمین کے اندر سے باہر نکل کر دندناتے ہُوئے تڑپتی ہُوئی اور آہ وزاری کرتی انسانی اور حیوانی زندگی کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔

......❖......

وہ بیٹھا ہُوا اپنے سامنے پڑی ایک پینٹنگ کو دیکھ رہا ہے۔ اِس کا یہ کیا حال ہو گیا؟ جب میں نے اِسے لیا تھا اُس وقت اِس کے سارے رنگ خُوب صُورت اور بھرپُور تھے۔ پینٹنگ بھی ایسی لاجواب تھی جسے دیکھ کر رُوح تک مسرور ہو جاتی۔ اب وہ جگہ جگہ سے پھٹی ہُوئی ہے۔ وہ صاف دِکھائی نہیں دیتی بَل کہ ایک انجانی اور بے مزہ لگتی ہے۔

وہ ایک حملے کی پینٹنگ ہے جس میں پُرانے زمانے کی بھرپُور اور خُوب صُورت عکاسی کی گئی تھی۔ اُسے بیچنے والے نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کسی قدیم قلعے سے دریافت ہوئی ہے۔ اُس کا مالک بہت مجبور تھا یا کوئی چور، جس نے اُسے بے حد سستا فروخت کر دیا تھا۔ جب اُس نے اُسے خریدا تھا تو یُوں لگتا تھا جیسے گھوڑے، ہاتھی اور تلواریں اُس میں نکل کر اُس کے سامنے لڑنے لگیں گے۔

اُس نے اُسے اپنی کمرے کی دائیں دِیوار پر ٹانگا اور صبح یا شام کو — اُسے جب بھی وقت ملتا — وہ اُسے بغور دیکھتا رہتا اور پھر پتا نہیں کیوں اُس نے اُسے اُتار کر گودام میں رکھ دیا تھا۔

آج گھر کی صفائی کرتے ہُوئے اُس کی نظر اُس پر پڑی تو اُسے اُس کی حالت

دیکھ کر بہت افسوس ہُوا۔

اُس نے اُسے سامنے والی دِیوار پر ٹانگنے کا سوچا لیکن اب اُس کا خیال تھا کہ پہلے اُسے اُس کی اِصل حالت میں لے آئے۔

ایک بڑا پیڑ اُس کی دِیوار کے ساتھ ٹنگا کھڑا ہے۔
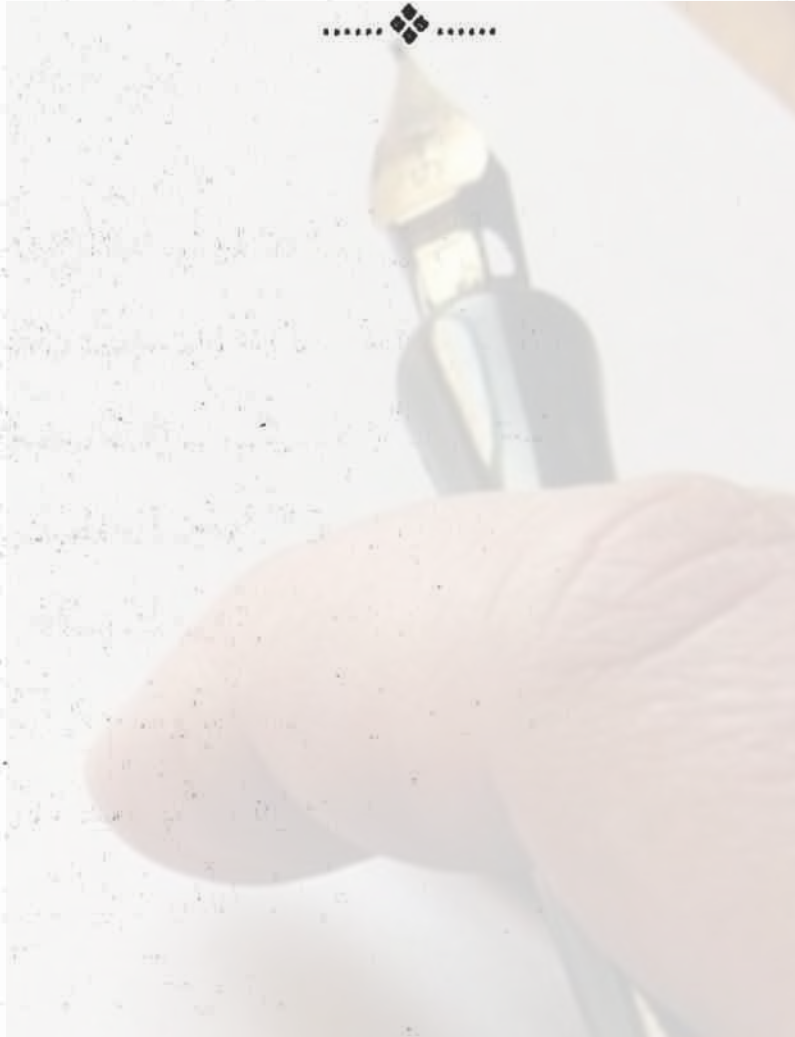
وہ ایک لکھاری تھا، ایک عجب لکھاری۔ انوکھی طرز کی کہانیاں لکھتا اور صرف سچ لکھنا ہی اُس کا مطمعِ نظر تھا۔ سچ کی تلاش میں وہ اکثر مارا مارا پھرتا اور جب اُسے کوئی سچی کہانی مل جاتی تو وہ اُسے لکھنے بیٹھ جاتا۔ پھر وہ کسی اَور کہانی کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑا ہوتا اور جب تک اُسے کوئی منفرد کہانی نہ مل جاتی وہ سفر میں رہتا۔ اُس کا بس یہی مقصدِ حیات تھا۔

وہ اپنی نئی کہانی کو ڈھونڈنے نکلا اور قریہ قریہ، بستی بستی گھومنے لگا۔ گھومتے پھرتے وہ ایک ایسی بستی میں جا پہنچا جہاں اُس نے ایک ایسا پیڑ دیکھا جس کا تذکرہ اُس نے کبھی پڑھا تھا نہ کسی سے سنا تھا۔ پیڑ اِتنا بڑا تھا کہ حیرت سے اُس کی سٹی گُم ہو گئی۔ اُسے وہ پیڑ پُراسرار لگا جیسے کوئی بھید ہو۔

اُس نے بستی والوں سے اُس پیڑ کے بارے میں دریافت کرنا شروع کیا تو اُس کے سامنے ایسی بے شمار رَوایات آئیں جنھوں نے اُس کے شوقِ جستجو کو بڑھا دیا۔

لوگ اُسے پنج ہزاری کے نام سے پُکارتے اور کہتے تھے کہ وہ پیڑ پانچ ہزار برس قدیم ہے۔ یہ بات اُسے انوکھی لگی کہ پانچ ہزار برس قدیمی درخت وہاں موجود ہے۔ لوگوں

نے اُسے اُس کے بارے میں جتنا کچھ بتایا وہ بہت کم تھا۔ بس روایتیں تھیں جو اپنے باپ دادا سے سنتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن اُس نے کامل سچ ڈھونڈنا تھا۔ ادھورے سچ یا محض روایتوں سے بات نہیں بن رہی تھی۔ کہانی نہیں لکھی جا سکتی تھی مگر وہاں کوئی ایسا شخص بھی نہیں تھا جو اُسے بے کم و کاست سب کچھ بتا سکے۔ اسرار حد سے زیادہ بڑھ گیا اور وہ ادھورے سچ کے عذاب کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے لوٹنا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اِس چیز نے اُسے نئی فکروں اور عذاب سے دوچار کر دیا تھا۔

اُس نے ہمیشہ پُوری بات ڈھونڈی تھی اور کامل قِصّہ بھی۔

اُس کی یہ فطرت نہیں تھی کہ اپنے کام کو ادھورا چھوڑ دے۔ وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اُس کے اندر سے آواز آئی۔ ''بھید ضرور کھلے گا۔ سچ مل جائے گا لیکن اِس میں وقت لگے گا۔'' اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''یہ کیسے ہو گا؟ مجھے پنج ہزاری کے بارے میں کون بتائے گا؟ کوئی پانچ ہزار برس کی عمر والا شخص؟ اُس کا ہم عمر آدمی ملنا محال ہے۔ پھر؟ سچ کیسے کھنگالا جا سکتا ہے؟ بستی والوں کو جو کچھ پتا تھا اُنھوں نے بتا دیا۔ کوئی اَور طریقہ نہیں۔'' اُس کے اندر سے کوئی بولا۔ ''آخر کوئی تو ہو گا۔''

اپنی سوچوں میں غرق وہ پنج ہزاری کے نیچے آ بیٹھا۔

دو دِن تک وہ اپنی سوچوں میں کھویا ہُوا اُس کے نیچے بیٹھا رہا۔ یکا یک اُسے ایک خیال آیا۔

''اُس نے اب تک اِس بستی کی قریبی ایک آدھ بستی کے باسیوں سے ہی اِس کے بارے میں پُوچھ گچھ کی ہے، باقی بستیوں کے لوگوں کے پاس بھی اِس کے متعلق معلومات ہوں گی۔ آخر اِتنا قدیم پیڑ ہے، اِس کے بارے میں کوئی نئی بات، کوئی اَور بھید بھی تو مل سکتا ہے۔''

یہ سوچنے کے بعد وہ روز علی الصبح کسی قریب یا دُور پرے کی بستی کو روانہ ہوتا اور شام یا رات پڑے جب بھی پلٹتا تو مایوس چہرہ لیے اُس کے نیچے آ بیٹھتا۔ اُسے تمام بستیوں سے بس اُتنا ہی معلوم ہُوا جتنا اُس بستی کے باسیوں نے بتایا تھا۔ آخر کار، تنگ آ کر اُس نے سوچا کہ جو ملے گا وہیں سے ملے گا، اِدھر اُدھر سر پٹخنے سے نہیں۔

وہ کئی روز سے گھر سے نکلا ہُوا تھا اور اب اُس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ داڑھی اِتنی بڑھ گئی تھی کہ چہرے مہرے سے سادھو لگنے لگا تھا۔ ہر وقت کی سوچ بچار سے آنکھیں خالی خالی دِکھائی دینے لگیں اور اُن کے گِرد حلقے گہرے ہو گئے تھے۔ کوّے کے پنجے ایسی لکیریں اُس کے چہرے پر اِتنی نمایاں ہو گئی تھیں کہ وہ واقعی کوئی پہنچا ہُوا بزرگ لگنے لگا تھا۔ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ پنج ہزاری کی برکت کے طفیل ایک بزرگ وہاں آ کر قیام پذیر ہو گیا تھا۔ اب لوگ اکثر اُس کے پاس آ بیٹھتے، اُسے اپنا حال احوال بتاتے اور دُعا کی خواہش کا اظہار کرتے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا لیکن کوئی جواب دیے بغیر بس چُپ چاپ بیٹھا رہتا۔ وہ اُس کے لیے مختلف قسم کے سالن، روٹیاں، چاول، غرض جس کی جتنی استطاعت ہوتی، اُٹھائے لاتا۔ وہ اُن کے سامنے کچھ نہ کھاتا لیکن جب وہ سب چلے جاتے تو اپنا شِکم بھر لیتا۔

ایک رات اُسے بیٹھے بیٹھے یاد آیا کہ اُس نے لوگوں سے سنا تھا کہ وہ اُس کے مُڈھ تلے جا کر دُعائیں مانگتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ مُڈھ کے نیچے جا کر مُرادیں جلد پُوری ہوتی ہیں اگرچہ اُس پیڑ نے اپنی داڑھی سخت کر کے اکڑا لی تھی تا کہ لوگ وہاں تک نہ پہنچ سکیں۔ مجھے بھی دیکھنا چاہیے کہ لوگ وہاں کیسے جاتے اور دعائیں مانگتے ہیں۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس نے سوچا۔ ''کیا میں بھی جا سکتا ہوں؟'' پہلے اُسے یہ کام دُشوار اور عجیب لگا لیکن سچ سے پردہ ہٹانا تھا۔ ''داڑھی کو کیسے پرے ہٹایا جا سکتا ہے؟'' یہ سوچ کر اُس نے داڑھی کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا

کہ وہ اُسے اندر جانے کے لیے راستہ دے رہا ہے جیسے وہ خُود بھی وہی چاہتا ہو جو اُس کے اپنے من میں تھا۔

رات کے آخری پہر اُس نے آواز سننے کے لیے اپنے کان کے پیچھے انگوٹھا رکھ کر باقی ہاتھ کو سیدھا کیا۔ اُس کے کان میں کوئی مِن مِن کر رہا تھا۔ وہ حواس باختہ ہو گیا کہ وہاں کون سرگوشیاں کر رہا ہے؟ اور کیا کہہ رہا ہے؟ اُس نے کان لگائے لیکن اُس کے پلّے کوئی بات نہ پڑی۔ اُس نے پنج ہزاری کے سارے گھیر کا چکّر لگایا۔ اُسے کوئی نہیں ملا۔ اُس نے دوبارہ چکّر لگایا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اُس نے کئی پھیرے لگائے، مِن مِن تھی لیکن وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔ وہ دہل اُٹھا اور سبک قدمی سے چلتا ہُوا باہر نکل آیا۔ خوف سے اُس کا سانس اور دِل دونوں بند ہُوئے جا رہے تھے۔ اُس کا سانس کچھ سنبھلا تو اُس نے باہر کی جانب نظر دوڑائی۔ باہر تاروں کی دِھیمی دِھیمی روشنی میں کوئی دِکھائی نہیں دیا۔ اُس نے سوچا: پنج ہزاری کی کسی شاخ پر بیٹھا ہو — شاید کوئی قدیم انسان۔ لیکن اُسے اپنا یہ خیال وہم سے زیادہ کچھ نہیں لگا۔ گو وہ خائف تھا لیکن اُس کے اندر ایک اُمنگ تھی اور وہ دوبارہ پنج ہزاری کے اندر گھس گیا۔ ایک بار پھر مِن مِن ہونے لگی۔ اُس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں لیکن اندھیرے کے سِوا کوئی نہیں تھا اور تاریکی نے ایک مرتبہ پھر اُس کے ہوش و حواس اُڑا دیے۔ وہ ابھی یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ آواز ذرا سی بلند ہُوئی۔ اُس نے دوبارہ کان لگا کر غور سے سنا لیکن اِس بار بھی اُس کے پلّے کچھ نہیں پڑا۔ وہ مارے ڈر کے بھاگنے ہی لگا تھا کہ اُس کے دِل میں آواز اُبھری۔ ''سچ مل کر رہے گا۔ اگر اب نہ ملا تو کبھی نہیں ملے گا۔''

اِس بات نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ اُس نے غور سے سنا تو یُوں لگا جیسے اُس کی اپنی بولی میں بات ہو رہی ہو۔

''لوگ مجھے پنج ہزاری کہتے ہیں۔ میری بات پر دھیان دو۔ ڈرو نہیں۔ میں تمھارا

دوست ہوں، دُشمن نہیں۔'' اُسے خائف دیکھ کر وہ بولا۔ ''میں تمھارے ساتھ کچھ ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو آج تک کسی کے ساتھ نہیں کیں۔'' وہ یہ کہہ کر چُپ ہو گیا۔

''کون سی باتیں؟'' اُس نے خوف سے کانپتے ہُوئے پُوچھا۔

''وہ باتیں جن کا آج تک کسی کو پتا نہیں چلا۔ آغازِ دُنیا سے لے کر آج تک کی تمام باتیں۔ وہ سچی باتیں جو لکھاری آج تک نہیں لکھ پائے۔'' تھوڑی دیر چُپ رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''تم ایک لکھاری ہو اور لکھنا تمھارا کام ہے۔ آج میں تمھیں ایک ایسا سچ بتاؤں گا کہ جسے تم لکھ سکو۔ لوگوں کو وہ بتا سکو جس کا آج تک کسی کو پتا نہیں اور لوگ جھوٹ کو سچ سمجھتے آ رہے ہیں۔ تم اِسے ہر حال میں لکھو گے۔ یہ میری امانت ہے۔''

لکھاری خاموش رہا۔

وہ دوبارہ بولا۔ ''یہ ایک دُکھ بھرا طویل قِصّہ ہے، ہزاروں برس پُرانا۔''

اُس کا خوف جاتا رہا تھا اور اُس کے کان ہمہ تن گوش اور آنکھیں اُس پر ٹِکی ہُوئی تھیں۔

''میں جب پیدا ہُوا تھا تو یہاں ہر طرف جنگل ہوتا تھا۔ مجھ سے بھی بڑے بڑے پیڑ—— عظیم الجثہ جانور بھی۔ انسان بہت کم تھے۔ پاس ہی ایک ندّی بہتی تھی اور دُوسری طرف ایک گھنا جنگل تھا۔ دونوں کے درمیان، جہاں اب بستی ہے، اُس وقت ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ اُس آبادی کے لوگ بہت بھولے اور سیدھے سادے تھے۔ وہ شاذونادر اپنے تن پتّوں سے ڈھانپتے تھے۔ گرمی سردی خندہ پیشانی سے سہتے اور اپنی دھرتی سے سچا پیار اور لاڈ کرتے تھے۔ تمھیں پتا ہو گا کہ انسانوں پر موسم کتنا اثر انداز ہوتا ہے۔ کبھی کبھار تو یُوں لگتا جیسے لوگ موسموں کی طرح ہی جنمتے تھے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ موسموں نے اُن کی طبیعتوں پر بہت اثر ڈالا۔ خیر...... ایک روز......''

لکھاری کان لگا کر سن رہا تھا اور جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی گئی اُس کا مُنھ حیرانی سے کبھی کھل جاتا، کبھی دُکھ سے اُس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور گالوں سے ہوتے ہُوئے آنسو نیچے گرنے لگتے۔ لیکن وہ چُپ چاپ سنتا رہا۔

صبح ہو گئی۔ لوگ وہاں سے گذرتے رہے لیکن وہ اپنی گردن جھکائے زمین کو تکتا رہا۔ کبھی اپنے اُنگلیوں سے لکیریں لگاتا تو کبھی اپنی لگائی ہُوئی لکیروں کو مٹا ڈالتا۔ آج کئی روز کے بعد اُس کے چہرے پر اُفسردگی اور دُکھ صاف دِکھائی دے رہے تھے۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔

''اِس طرح بھی ہو سکتا تھا۔ اِس طرح......؟'' وہ بُڑبڑایا۔

معلوم نہیں وہ کتنا عرصہ پنج ہزاری کی داڑھی کے گھیر میں بیٹھا اُس کی کہانی سنتا رہا۔ جب اُسے بُھوک لگتی تو وہ وہاں سے نکل کر تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور لوگوں کا لایا ہُوا دال دلیا کھا لیتا۔ کہانی چلتی رہی، چلتی رہی۔ آخر ایک روز کہانی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

''یہ سچ ایک امانت ہے۔ یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک تم اِسے لکھ نہ لو، کسی کو مت بتانا۔''

اُس نے پنج ہزاری سے اجازت لی۔

......❖......

دُنیا بھر میں گھٹا سے جان چھڑوانے کے لیے جہاں سائنسی ادارے اپنا کام کر رہے تھے وہیں دُوسرے لوگ بھی اپنے اپنے جتن میں جتے ہُوئے تھے۔ جگہ جگہ لوگوں کے جتھے جمع ہوتے جن میں گھٹا کو ختم کرنے کے لیے صلاح مشورے دیے جاتے اور پھر ٹولی جو فیصلہ کرتی اُس پر عمل کرنے کا جتن کیا جاتا۔

اُس بستی میں شام کے وقت چاچا موسیٰ کے گھر بستی کے سرکردہ لوگ اور سیانے جمع ہُوئے۔ وہ سب اِس بات پر غور وخوض کررہے تھے کہ گھٹا کو ختم کرنے کے لیے کیا کِیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اپنی صلاح دینا چاہتا تھا لیکن چاچا موسیٰ سر پر پٹکا باندھے اپنی بُڈّھی آنکھیں گھما گھما کر بات کرنے والے ہر فرد کو دیکھ رہا تھا۔

بڑی عمر کے ایک شخص نے، جو چاچا موسیٰ سے عمر میں چھوٹا تھا، کہا۔ ''ہم گھٹا کا توڑ کرنے کے لیے وہ عمل نہیں کیے جنھیں کرنا ضروری تھا۔''

اُس کا اِتنا کہنا تھا کہ مجمعے میں بیٹھا ایک شخص، جس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے، یُوں اُچھلا جیسے اِس بات سے اُسے آگ لگ گئی ہو۔ ''ہم نے عمل نہیں کیے؟'' وہ چیخ کر اُونچی آواز میں بولا۔ ''یہ بات تم ہم سے کہہ رہے ہو؟ ہمارے سانس حلق میں اٹک رہے ہیں، ہم نے ہر خانقاہ پر منّت مانگی، ہر وہ کام کیا جو ہمیں آتا تھا۔ اب بھی تم ہمیں یہ کہہ رہے

ہو کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ ہم اپنے آپ کو اور اپنے بال بچّوں کی زندگیاں ختم کرنا چاہتے ہیں!
واہ جی واہ، ہمارا جو کام تھا ہم نے پُورا کیا۔ یہ تمھارا کام تھا کہ ہمیں بتاتے کہ یہ کرو، وہ کرو۔
ہم جو کچھ جانتے تھے ہم نے کیا۔" اُس نے ایک ہی سانس میں اپنی بات ختم کی۔

"آرام سے بیٹھ کر تسلّی سے بات کرو۔ ہم آج ایک دُوسرے پر الزام دھرنے کے لیے نہیں، اِس مسئلے کے حل کے لیے بیٹھے ہیں۔" چاچا موسیٰ نے پیار سے کہا تو وہ چُپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پھر تمام لوگوں کو دیکھتے ہُوئے چاچا نے کہا۔ "تم سب سیانے بیانے ہو۔ آج مل بیٹھنے کا مقصد بھی تمھیں پتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اِس گھٹا کا توڑ کیا ہے؟"

"ہم نے اپنے طور پر ہر وہ کام کر لیا جو ہمارے بڑے بُوڑھے ہمیں بتا گئے تھے لیکن گھٹا ختم نہیں ہو رہی تو ہم کیا کریں!"

"اتوار کے دربار مَنّت مانگنے گئے ہو؟" چاچا نے دریافت کیا۔

"اتوار کا دربار؟" ایک بولا۔

"وہ کون سا ہے؟" دُوسرے نے استفسار کیا۔

"ہم نے پہلے اِس کا نام نہیں سنا۔" ایک اَور نے کہا۔

"ہے ایک دربار۔" چاچا موسیٰ نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا۔ "اپنے زمانے کا مشہور اور بڑا مزار جہاں لوگوں کی تمام مَنّتیں پُوری ہوتی تھیں۔ ساتھ والی بستی سے چھے کوس پر......"

ابھی چاچا موسیٰ کی بات پُوری نہیں ہُوئی تھی کہ ایک آدمی بولا۔ "ہاں، ہاں۔ ہم نے وہاں بھی اور دُوسرے مزاروں پر بھی مَنّت مانگی ہے۔ ہم نے دُعائیں کروائیں، اذانیں دیں، عمل کیے ـــ خیر خیرات، غرض ہر وہ کام کیا جو ممکن تھا۔"

"لیکن کچھ ہوتا دِکھائی نہیں دے رہا۔" ایک اَور شخص نے یہ کہہ کر چاچا کی طرف دیکھا۔

چاچا موسیٰ کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے وہ آگاہ ہو کہ گھٹا سے کیسے جان چھڑوائی جا سکتی ہے۔ اُس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہُوئے کہا۔ ''میرا اعتبار کرو، کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب میں نے دُعا نہ مانگی ہو۔ لیکن اب تک دُعائیں بے اثر رہی ہیں۔ ساری بستی حواس باختہ اور سہمی ہُوئی ہے۔ ہم بس ایک ہی کام رہ گیا ہے کہ ہم سارے جمع ہو کر رات بھر مسجد میں رہیں، شاید کسی کی دُعا پُوری ہو جائے۔''

ممدو خان نے — جسے چاچا موسیٰ کے بعد سب اپنا بزرگ مانتے تھے اور آنکھیں بند کیے سب کی باتیں سن رہا تھا — یکا یک اپنی آنکھیں کھولیں اور آسمان کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔ ''مجھے یُوں لگتا ہے جیسے گھٹا ختم نہیں ہوگی ختم چاہے کر دے!''

ابھی یہ بات اُس کے ہونٹوں پر تھی کہ بادل اِتنے زور سے گرجا کہ وہاں موجود تمام لوگوں کے وجود کانپنے لگے اور ساتھ ہی بجلی بھی ایسے کڑکی کہ لوگوں کو اپنی جان نکلتی محسوس ہُوئی۔ بجلی کا لشکارا اِس قدر تیز تھا کہ صرف اُس مجمعے کے لوگ ہی نہیں بَل کہ جس آدمی کی آنکھ میں بھی وہ لشکارا پڑا وہ جہاں کا تہاں بے نور ہو گیا۔

وہ دِن اُن کے لیے قیامت کا دِن بن گیا۔ ایک چمک نے بے شمار لوگوں کی آنکھوں کا نُور چھین لیا۔ بینائی جانے سے لوگوں کی جینے کی آس جاتی رہی۔ دہشت اِتنی بڑھ گئی کہ کئی لوگ آنکھیں بند کر کے ٹٹول ٹٹول کر چلنے پھرنے لگے اور کئی نے گھروں سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ سب گھٹا کے ساتھ ساتھ بینائی کے بارے میں بھی متفکر ہو گئے: اگر یہ لشکارا دوبارہ پڑا تو سارے لوگ اندھے ہو جائیں گے۔ نابینا ہونے کی دہشت اِس قدر شدّید تھی کہ لوگ کچھ بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اُن پر یہ خوف بھی طاری تھا کہ اگر اُنھوں نے چمک سے متاثرہ لوگوں کی طرف دیکھ لیا تو وہ بھی متاثر نہ ہو جائیں۔

......❖......
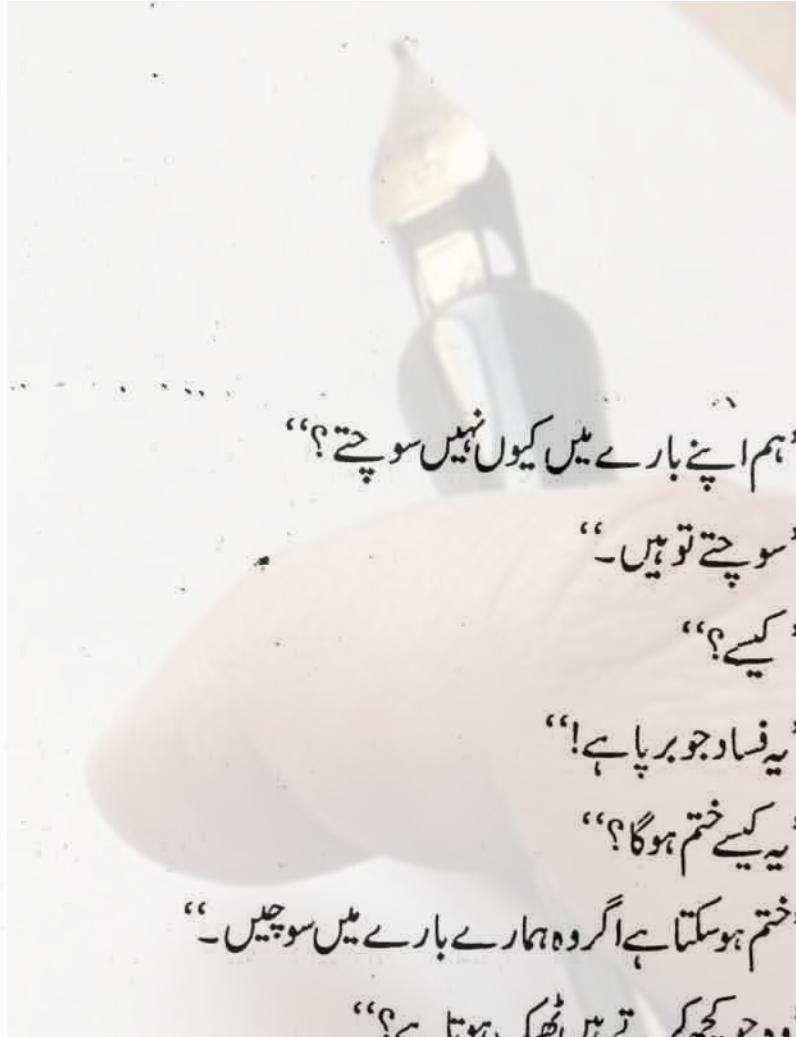
''ہم اپنے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟''

''سوچتے تو ہیں۔''

''کیسے؟''

''یہ فساد جو برپا ہے!''

''یہ کیسے ختم ہوگا؟''

''ختم ہوسکتا ہے اگر وہ ہمارے بارے میں سوچیں۔''

''وہ جو کچھ کرتے ہیں ٹھیک ہوتا ہے؟''

''وہ یہی سمجھتے ہیں۔''

''نہیں یار، ہمیں بیچتے ہیں۔''

''تو وہ کیا کریں؟''

''ہم کم زور ملکوں کا ایکا نہیں کروا سکتے؟''

''غلاموں کا کبھی ایکا ہُوا ہے؟''

''ہاں، کر تو سکتے ہیں لیکن کرتے نہیں۔''

''تو بھگتو!''

''بھگتو، بھگتو— کیوں بھگتیں؟''

......❖......
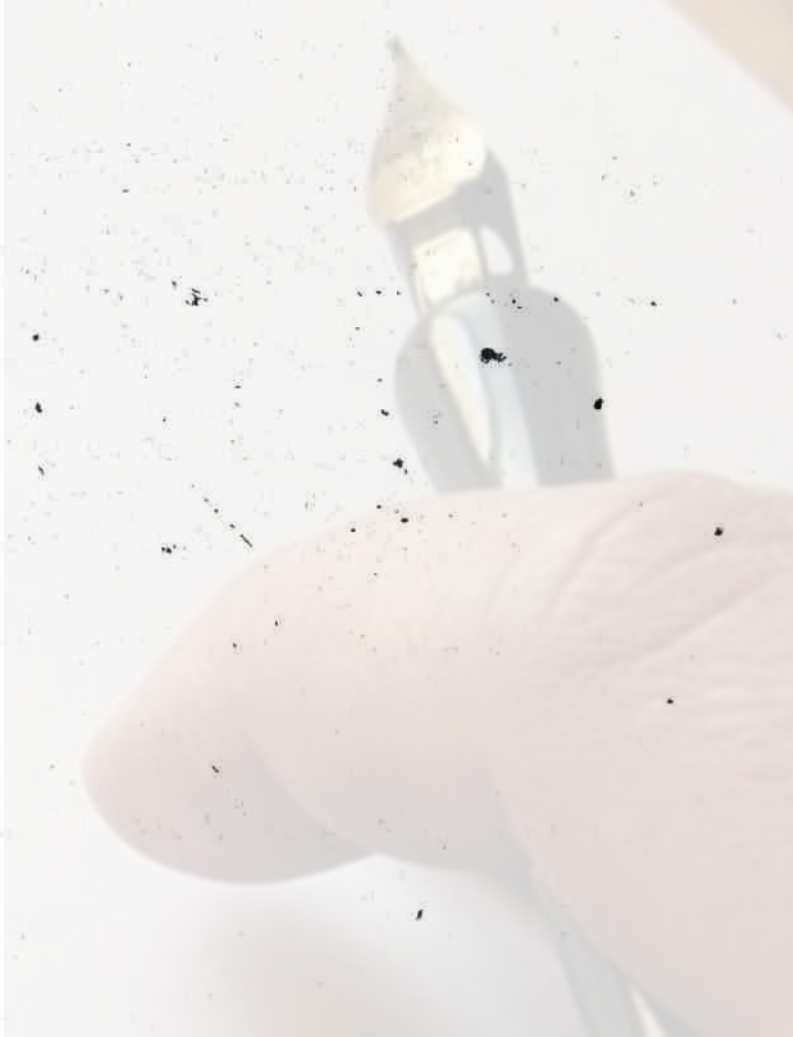
لوگ باگ ابھی اپنی خوف زدہ نیند کی جھپکی میں تھے کہ نصف شب کو ایک چیخ اُن کے کانوں میں پڑی۔ چیخ اِتنی تیکھی، ڈراوَنی اور درد بھری تھی کہ سوئے ہُوئے لوگ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگ اُٹھے۔ جس کا جس طرف مُنھ ہُوا اُس نے وہی سمت پکڑ لی۔ ایسی تیز اور دہشت بھری چیخ جس سے لوگوں کے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور اُن میں سے خُون بہنے لگا۔ بہت سے لوگوں کے دماغوں کی رَگیں بھی پھٹ گئیں اور خُون کی دھاریں پُھوٹ پڑیں۔ نابینائی کے بعد اب لوگ بہرے ہو کر، گرتے پڑتے بھاگتے ہُوئے دھاڑیں مار مار کر بَین کر رہے تھے۔

اُس چیخ نے انسانوں ہی کو نہیں جانوروں اور حشرات الارض تک کا خاتمہ کر دیا تھا۔ زمین، پہاڑ، پیڑ، جانور، غرض کوئی چیز نہیں بچی تھی جو چیخ کی لپیٹ میں نہ آئی ہو۔ دھرتی ہچکولے کھا رہی تھی۔ ڈولتی ہُوئی زمین پر دوڑتے بھاگتے لوگ بھی ڈھیتے ڈھاتے ہُوئے لڑھکنیاں کھا رہے تھے۔ کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس ایک افراتفری مچی تھی اور لوگ ایک دُوسرے کو دھکے دیتے آگے کی سمت دوڑتے ہُوئے چلّا رہے تھے۔ ہر جانب خُون ہی خُون پھیلا ہُوا تھا۔ لوگ مرتے اور ایک دُوسرے کے اُوپر ڈھے جا رہے تھے۔

چوگرد آپا دھاپی پڑی ہُوئی تھی اور ایسا شور وغوغا برپا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اُس تاریکی میں اندھادھند بھاگ رہے تھے۔ درخت اور پیڑ جڑوں سمیت اُکھڑ کر زمین میں دھنسے ہُوئے تھے اور لوگ ایک دُوسرے کو کہنیاں مار مار کر پیچھے پھینکتے ہُوئے اپنی اپنی جان بچانے کی تگ ودو میں لگے ہُوئے تھے۔ لڑھکنیاں کھاتی ہُوئی دھرتی پر گرے ایک اَدھ مُوئے شخص کے مُنھ سے نکلنے والا واحد لفظ صرف زمین ہی نے سنا تھا:

پَ......لَ......و......ت......ا......

......❖......

ایک مکڑی چاروں کونوں پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ کبھی ایک کونے میں تو کبھی دُوسرے میں......

اُس کی نظر چاروں کونوں پر ہے۔

وہ اُسے آتا دیکھ کر ایک کونے پر قبضہ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔

چوتھا کونا پہلے کونے پر اور پھر چوتھا کونا......

وہ آ کر کھڑا ہو کے کچھ دیر گہرے گہرے سانس لیتا ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے اُس کا سانس گھٹ گیا ہو اور وہ اُسے پُورا کرنے کے لیے باہر نکلا ہو۔ وہ اب بھی بڑے بڑے سانس لے رہا ہے۔

''شکر ہے، اِس کے ہاتھ میں کوئی پرچی کوئی گولا نہیں ہے ورنہ وہ اُسے اُس کے مُنھ پر دے مارتا۔'' ابھی اُس نے اِتنا ہی سوچا تھا کہ وہ دوبارہ کمرے کی جانب چل دیا۔

مکڑی ہَولے ہَولے چلتی ہے اور ساتھ کسی کاغذ پر جالا بُننے کی کوشش بھی کرتی چلی جاتی ہے۔

دِیوار سے گولا نیچے اُتر رہا ہے۔

ایک پرچی اُس کے پیٹ میں سے نکلتی ہے اور اُس کے سامنے بیٹھ کر مکڑی کے ساتھ کھیلنے لگتی ہے۔ مکڑی پرچی کے اُوپر چلنے لگتی ہے اور جُوں جُوں حرکت کرتی جاتی ہے تُوں تُوں پرچی پر لکھی تحریر کے اُوپر لکیریں پھرتی چلی جاتی ہیں۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ اُس کے مُنھ سے کچھ نہیں نکلتا۔

وہ یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے......

مکڑی پرچی کے اُوپر یُوں چلتی ہے جیسے مالک اپنی زمین پر۔

اُس کی نگاہ مکڑی کے بجائے اُس پرچی پر ہے جس پر کالی لکیریں پھری ہُوئی ہیں۔

......❖......
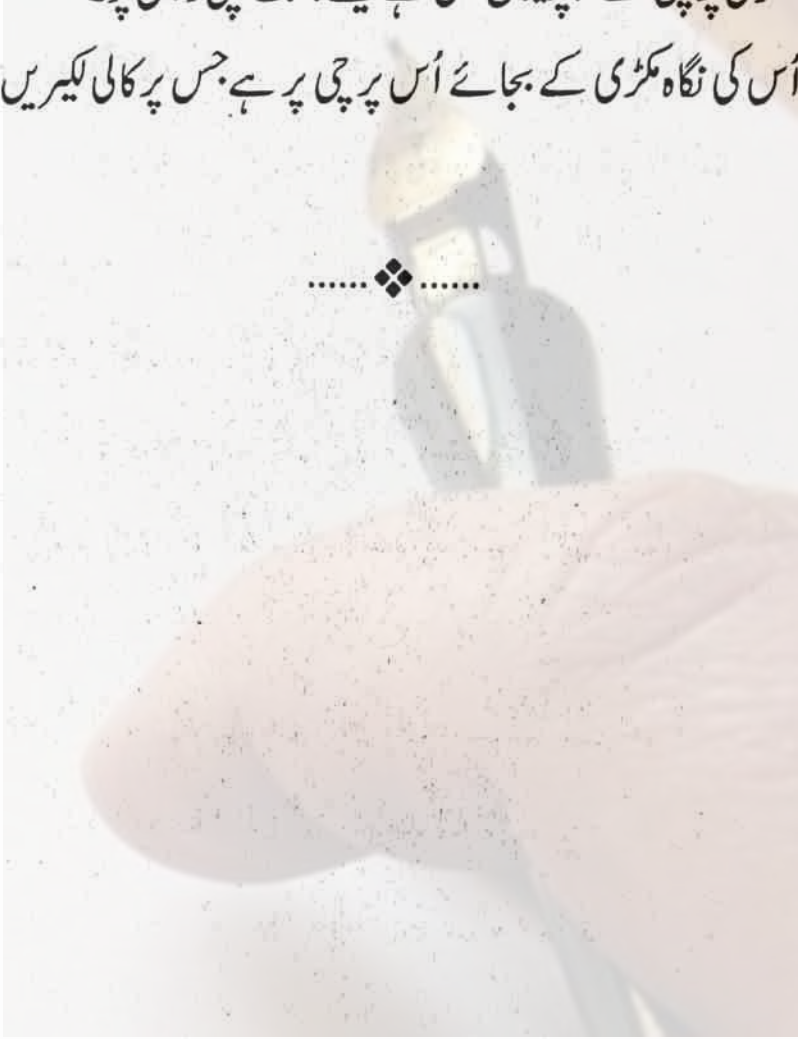
بُڑھاپا اور تنہائی سنگی ہیں۔ یہ بات اُس کے دِل میں بس گئی تھی۔ کسی نے اُسے بتایا تھا کہ زمین کی سات دُنیائیں ہیں اور ہر دُنیا میں ایک بَیل ہے جو اُسے اپنے سینگوں پر اُٹھائے ہُوئے ہے۔

اُن بَیلوں میں سے ایک تم ہو۔

''لیکن میرے تو سینگ نہیں ہیں۔'' اُسے ہمیشہ یہی سوچ آتی لیکن پتا نہیں کیوں اُسے یہی لگتا جیسے وہ اُن سات بَیلوں میں سے ایک ہے جنھوں نے زمین کو اپنے سینگوں پر اُٹھا رکھا ہے۔

وہ اپنے ایک سینگ پر سے وزن ہلکا کرنے کے لیے جھکا تو زمین اپنا مقام چھوڑ کر نیچے ہو گئی۔ اُس روز سے لوگوں میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ بالائی زمین کے ایک بَیل کے سینگ پچک گئے ہیں۔ اِسی لیے زمین اُونچی نیچی ہے۔ اُس کے سر کے دُوسرے سینگ کے مانند زمین بھی جھکتی چلی جا رہی ہے۔

......V......
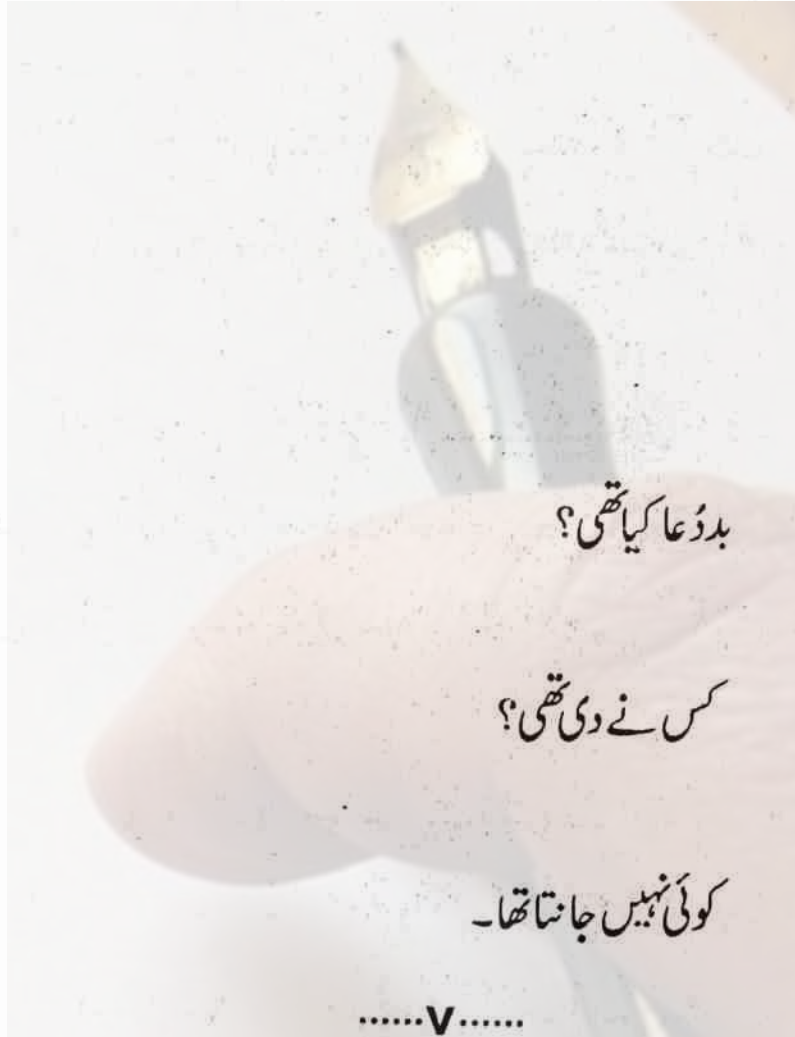
بددُعا کیا تھی؟

کس نے دی تھی؟

کوئی نہیں جانتا تھا۔

......٧......

''جب لہو بہنے لگتا ہے تو دھرتی تمھارے ساتھ نہیں ہوتی۔'' اُس نے لکھا اور قلم نیچے رکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ میں وہی کیوں نہ لکھوں جو مجھے بتایا گیا تھا؟ ہاں! یہی ٹھیک رہے گا۔

اُس نے دوبارہ قلم اُٹھایا اور آگے لکھنے لگا۔ ''اُس وقت سے ہی تمھارے ساتھ نہیں ہے جب پہلی مرتبہ ایک عورت کی خاطر...... خُون زمین پر بہا جس کے داغ اُبل رہے ہیں اور زمین ہچکولے کھا رہی ہے...... تمھارا خُون...... خُونی کی نسل کے خُون میں گھل مل گیا ہے......

منع کیا تھا تمھیں! سب سے پہلے زمین نے روکا! پھر آسمان، پھر دریا اور سمندر نے! پھر کائنات کی ہر شے نے! لیکن تم باز نہیں آئے، اپنی مرضی کی۔''

اُس نے اپنا لکھا ہُوا شروع سے آخر تک ایک بار پھر پڑھا اور اُس کا قلم دوبارہ رواں ہوگیا۔ ''لہو...... دھاوا...... لہو...... پھر حملہ...... لہو...... ہر جنگ کے وقت کیا ہُوا؟

...... دھرتی تمھیں دُہائیاں دیتی رہی اور پھر...... زمین......!

ہر بار ہر اُس چیز کو جس کی جڑیں اُس کے اندر تھیں اُسے منع کیا کہ تمھیں کوئی فائدہ

نہ پہنچائے۔ درختوں پر پھل نہ آیا، تمھارے بوئے ہُوئے بیج پھوٹنے نہیں دیے، پہاڑوں سے برف نہ پگھلی، دریا سُوکھ گئے کہ مچھلیاں تہ سے جا لگیں اور سمندر خشک ہو گئے۔ بستیاں ویران ہو گئیں۔ جب بھی قحط پڑا تو تمھارے پیٹ تمھاری پشت سے جا لگے۔ جب کبھی سیلاب آیا تو تمھیں بہا کر لے گیا۔ تمھارے کنبے کے کنبے ختم ہو گئے۔ جب زمین کو غصّہ آیا تو وہ لڑھکنیاں کھانے لگی اور اُس نے تمھاری آبادیاں تاراج کر دیں۔ آتش فشاں پھٹے اور اُن کے لاوے نے تمھیں ٹنڈ منڈ سوختہ لکڑی کے مانند کر دیا۔ ہر اشارے کنائے اور ہر تنبیہ کو نیا نام دے کر اپنا جواز گھڑا لیکن کیا اصل سبب کی طرف کسی کا دھیان گیا؟

وہ اپنا لکھا ایک بار پھر پڑھنے لگا۔ جُوں جُوں پڑھتا گیا تُوں تُوں اُس پر کپکپی طاری ہوتی چلی گئی اور وہ بے ساختہ بُڑبُڑایا۔
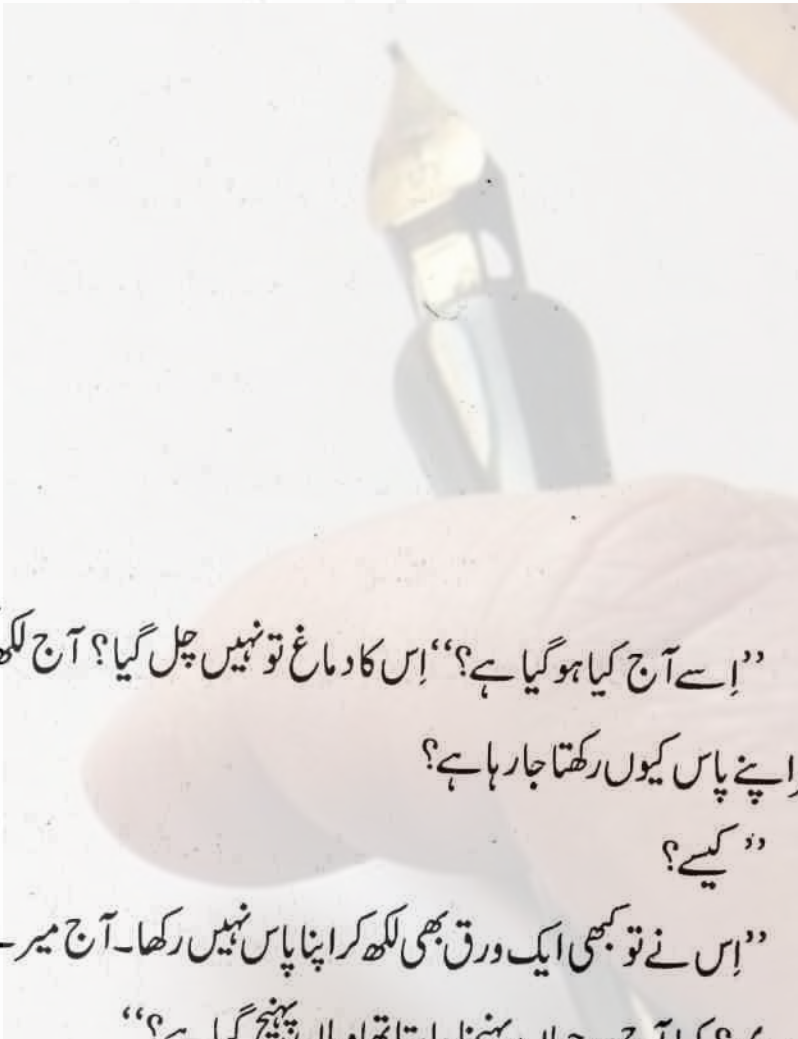
''یہ تو وہی ہے...... یہ تو وہی ہے...... وہی جو اُس نے مجھے نیلی روشنائی سے لکھ کر بھیجا تھا...... وہی...... جو...... میرے پڑھتے ہی اُس کے پتّے میں، ہَوا میں......''

یکا یک ہی جیسے اُس کی کپکپی ختم ہو گئی۔ اُس نے سُکھ کا سانس لیا اور دوبارہ تیزی سے لکھنے لگا۔

...... ❖ ......

''اِسے آج کیا ہو گیا ہے؟'' اِس کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ آج لکھ لکھ کر کاغذوں کے ڈھیر اپنے پاس کیوں رکھتا جا رہا ہے؟

''کیسے؟

''اِس نے تو کبھی ایک ورق بھی لکھ کر اپنا پاس نہیں رکھا۔ آج میرے شکم کو معافی کیسے دے دی؟ کیا آج وہ جہاں پہنچنا چاہتا تھا وہاں پہنچ گیا ہے؟''

......❖......

وہ ایک ایسی جنگ تھی جس کے بارے میں سوچتے ہی رُواں رُواں کھڑا ہو جاتا ہے اور پُورا بدن جھنجھنا اُٹھتا ہے۔ لوگوں کو خبر ہی نہیں تھی کہ اب کیا ہوگا کیوں کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں بھی چلے جائیں بچ نہیں سکتے۔ یہی سبب تھا کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ نہ ہی وہ ٹک سکتے تھے۔ لڑائی ایک جگہ ہوتی تو بھی نقل مکانی کا سوچا جا سکتا تھا۔ جنگ تو جگہ جگہ برپا تھی—— تمام کرۂ ارض پر۔ جب روایتی لڑائیاں اپنے عروج پر پہنچیں تو معاملہ ہاتھوں سے نکل گیا۔ تب تک زمین کی آدھی آبادی ختم ہو چکی تھی اور بچے کھچے لوگ پریشان اور متفکر تھے کہ کہاں جائیں؟ یہ اندیشہ بھی جان کے ساتھ لگا ہُوا تھا کہ اُنگلی کا ایک اشارہ ہوا اور سب کچھ تہس نہس ہو جائے۔

ہر کوئی سہما ہُوا اور آفت میں پڑا ہُوا تھا۔ اُن کے اندر کسی اَنہونی کی دہشت بیٹھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے۔ البتہ اُنھیں اِس کی کوئی خبر نہیں تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔

ایک طرف جنگ تو دُوسری جانب گھٹا تھی جو نہ چھٹنے کا نام لے رہی تھی اور نہ ہی برسنے کا۔ اُس نے زمین کو اِس طرح اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا کہ اُس کا رابطہ کائنات سے منقطع ہو گیا تھا۔

لوگوں کی جگہ ایک چلتا پھرتا خوف تھا۔ وہ دہشت سے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ پتا نہیں کس وقت گھٹا کی گرج کے ساتھ ایک کڑک ہُوئی۔ آواز سننے کی دیر تھی کہ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکلے اور جس کا جس طرف مُنھ ہُوا، بھاگ نکلا۔ کہیں امان نہ تھی۔ بس لوگ رُوئی کے مانند دُھنکے جا رہے تھے۔

آخر ڈر پُورا ہو کر رہا۔ یکا یک وہی ہُوا جس کا خوف تھا۔ دھرتی سے ایک تیز اور ڈراوَنی چیخ برآمد ہُوئی اور گھٹا کو چیرتی ہُوئی خلا سے گذر کر آسمان تک گئی۔ آواز کے ساتھ ہی ایک اَور کام ہُوا کہ گھٹا برسنے لگی۔ لال بُوندیں......

برستے مینھ میں وہ یُوں بھاگ رہا تھا جیسے دِیوانہ ہو گیا ہو اور کسی چیز کا ہوش نہ رہا ہو۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جسے بلند کر کے وہ زور زور سے چلّا رہا تھا۔

''یہ دیکھو، نامرادو! میں پہلے ہی سے کہتا اور لکھتا رہا ہوں لیکن تم مجھے پاگل سمجھتے رہے......!

''میں لکھتا اور بتاتا رہ گیا ہوں کہ اب تم نہیں بچو گے......''

برستے مینھ میں کاغذ بھیگ کر بھاری ہو گیا تھا لیکن اب بھی دائیں ہاتھ میں وہ بھیگا ہُوا کاغذ دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ دیکھو...... یہ دیکھو! جب خُون بہنے لگتا ہے تو زمین...... دھرتی کے وجود پر

پہلا خون بہنے کے وقت دی گئی بد دُعا... ...پُوری......پُوری نہ......ہو......!!!''

بجلی کی کڑک میں تمام آوازیں ڈوبتی چلی گئیں۔

پھر تو جیسے بجلی کی لپک نے زمین کا راستہ پالیا ہو۔

......❖......
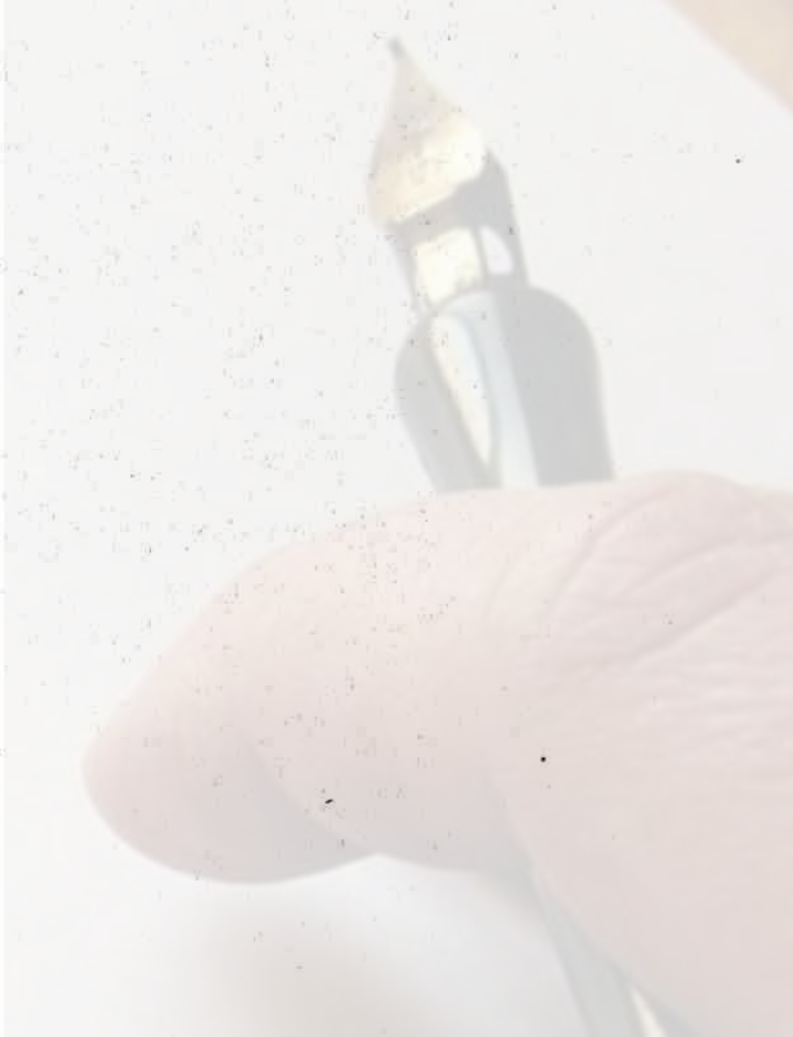
حرفِ آخر

مجھے اِس بات کا قطعی ادراک نہیں تھا کہ میرا سرائیکی ناول ''پُلُوتا'' اِس قابل ہوگا کہ اِس کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے گا مگر کمال مہربانی ہے نجم الدّین احمد صاحب کی کہ جنھوں نے نہ صرف اِس کا خُوب صُورت اور رَواں ترجمہ کر کے میرے سامنے لا رکھا بَل کہ میں خُود ورطۂ حیرت میں ڈُوب گیا کیوں کہ اس ناول کو اُردو کے قالب میں ڈھالنا نہ صرف دُشوار تھا بَل کہ سچ کہوں تو ناممکن بھی۔

میں ذاتی طور پر نجم الدّین احمد کا شکر گذار ہوں کہ اُنھوں نے کٹھن مراحل سے گذر کر اِس ناول کو اُردو دان طبقے کے لیے اُسی طرح اُردو میں ڈھالا جس طرح میں چاہتا تھا یعنی اصل متن سے انحراف کیے بغیر ہنروری سے اصل رُوح کی ترسیل۔

اب یہ قارئین پر منحصر ہے کہ وہ اِس کو قابل اعتنا سمجھتے ہیں یا پھر ''ردّی کی ٹوکری'' کی شکم پُری کرتے ہیں۔

سلیم شہزاد

۰۴/جون، ۲۰۱۹ء

دھرتی پر جب پہلا خون بہا تو زمین نے گریز پائی کی نصیحت کرتے ہُوئے انسان کو متنبہ کیا، خبردار کیا، ڈرایا، دھمکایا اور ہوش دِلایا لیکن حضرتِ انسان نے کان نہ دھرا بلکہ اُس کے کان پر جُوں تک نہ رینگی اور وہ اپنی ہوسِ اقتدار و اختیار اور اپنی خُود ساختہ جھوٹی جاہ وحشمت کی راہ میں آنے والی ہر رُکاوٹ کو تہس نہس کرتا، ہر ذی رُوح کو تہِ تیغ کرتا، دھرتی کے سینے کو لال کرتا درحقیقت اپنی ہی بقا کو تہس نہس اور تہِ تیغ کرتا چلا گیا۔ زمین ہر بار ہوش دِلانے کی سعی کرتی رہی لیکن وہ اُتنا ہی ہوش وخرد سے بیگانہ ہو کر دِیوانہ وار آج اُس مقام پر آ پہنچا ہے جہاں تباہی و بربادی اُس کی اُنگلی کے اشارے پر ہے اور زمین کی بیخ پائی اپنے بامِ عروج پر۔ اگر آہ و بددُعا فضا چیرتی ہُوئی فرش سے عرش تک جا سکتی ہے تو......تو کیا ہوگا؟ اور بس اِتنا ہی کہنا ہے کہ یہ ناول سرائیکی زبان کے اُس ناول نگار کی کاوش ہے جس کے پہلے ناول ''گھان'' (گرداب بھنور) کی اشاعت پر سرائیکی کے معروف شاعر اور دانش ور جناب رفعت عباس نے رائے زنی کرتے ہُوئے قرار دیا تھا: ''سرائیکی زبان کو اپنا ناول مل گیا۔'' کیوں کہ سرائیکی ناول کا یکسر رُخ تبدیل کرنے کا سہرا سلیم شہزاد کے سر پر ہے۔ اِس ناول کا ترجمہ معروف مترجم جناب نجم الدّین احمد نے کیا ہے جن کے تراجم اپنی سند تسلیم کروا چکے ہیں۔

AKSPUBLICATIONS
Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com